ابوالکلام آفاقی

"چاندنی بیگم" ـــــ ایک مطالعہ

قرۃ العین حیدر کا یہ ناول 1990ء میں شائع ہو کر ادبی دنیا میں اپنی سماجی، ثقافتی، سیاسی، معاشی اور بین الاقوامی رنگا رنگی کو اپنے بطن میں سموئے ہوئے تبدیل پذیری کے اصول کے ساتھ قدم رکھتا ہے۔ یہ ناول تقریباً چالیس سالہ ہندستانی معاشرے کا احاطہ کرتا ہے۔ ناول کا پس منظر اودھ کے آخری اعلیٰ طبقے کی زائل ہوتی ہوئی تہذیبی اقدار اور ابھرتے ہوئے نئے سرمایہ دارانہ سماج اور اقدار سے تعلق رکھتا ہے۔ یوپی بالخصوص لکھنؤ کو اس تہذیب کا مرکزی علاقہ ٹھہرا کر پورے ہندستانی معاشرے کے مختلف پہلوؤں اور مخصوص عبوری دور کی صورتِ حال کی منظر کشی کی گئی ہے جس کے مختلف اجزا مخلوط ہیں۔ شروع شروع میں مشترکہ تہذیب و تمدن اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے نقوش رونما ہوتے ہیں جن میں مختلف فرقوں اور طبقوں کی شمولیت واضح ہے۔ رفتہ رفتہ یہ خصائص زائل ہوتے ہیں اور ناخوشگوار حالات ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ ناول میں پیش کیے گئے تقریباً تمام مسائل عصری ہیں۔

آزادی اور تقسیم ہند کے بعد پورے معاشرے میں غضب کی تبدیلی رونما ہوئی۔ جاگیرداری کے قانوناً خاتمے کے بعد معاشرے میں بڑا تلاطم برپا ہوا۔ معاشرے کی معاشی بنیادوں اور ان پر مبنی اداروں میں غضب کی تبدیلی رونما ہوئی۔ پالکیوں اور بگھیوں کے دن ختم ہو گئے۔ تانگے اور یکے بھی اب نہ رہے۔ ان کی جگہ سائیکلوں اور رکشاؤں نے لے لی۔ قیام پاکستان کے باعث متروکہ جائیدادوں کے مسائل پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے:۔

"اچانک سین بدلا۔ تعلقہ داران و بیگمات مع کاروں پالکیوں اور بگھیوں کے غائب۔ بہت جلد تانگے اور یکے بھی معدوم ہو گئے۔ سائیکلوں اور رکشاؤں

کا سیلاب امڈ آیا۔ ان پر سوار ایسے موکل بستے تھامے برساتی میں داخل ہوئے جن کی املاک کسی ایک عزیز کی پاکستان روانگی کے سبب متروکہ قرار دے دی گئی تھیں۔"

تقسیم ہند اور قیام پاکستان کے بعد ہندستان میں عام طور پر مسلم لڑکوں اور لڑکیوں اور بالخصوص اعلیٰ طبقے کے مسلم لڑکوں اور لڑکیوں کا عددی تناسب درہم برہم ہو گیا تھا۔ قیام پاکستان کی تحریک میں شرفا پیش پیش تھے۔ قیام پاکستان کے وقت وہ ہندستان سے پاکستان منتقل ہو گئے۔ نتیجتاً یہاں رہ جانے والی لڑکیوں کے لیے اچھے رشتے خواب و خیال ہو گئے۔ اس پہلو کی بھی جھلک اس ناول میں ملتی ہے۔ پروین سلطانہ اور زرینہ سلطان کی گفتگو سے اس بات کی وضاحت ہوتی ہے:۔

"تمھیں احساس ہی نہیں کہ یہاں شروع شروع میں شرفا کی ہجرت کے بعد باقی ماندہ لڑکیوں پر کیا بیتی۔ ان کے لیے رشتے غائب ہو گئے۔"

آزادی اور قیام پاکستان کے بعد ہندستانی مسلمانوں کو درپیش اس مسئلے کے دو تین ممکنہ وجوہ سمجھ میں آتے ہیں۔ ایک وجہ تو یہ ہو سکتی ہے کہ مسلم اشرافیہ (Elite) جو قیام پاکستان میں آگے آگے تھا، سب کچھ چھوڑ کر پاکستان چلا گیا تھا۔ دوسری ممکنہ وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ مرد جو اس طرح کے معاملات میں پیش پیش ہوتے ہیں، جانی نقصان انھیں کو برداشت کرنا پڑتا ہے لیکن وقت کے ساتھ ساتھ یہ خلا پُر ہو گیا۔ مسلم معاشرے کے ہر شعبے میں اشرافیہ (Elite) طبقہ ابھر کر سامنے آیا۔ تعلیم یافتہ لڑکے رشتے کے لیے ملنے لگے اور یہ سماجی انتشار دھیرے دھیرے ختم ہو گیا۔ دوسری طرف ہندوپاک کے درمیان باہمی تعلقات کا پارہ اترتا چڑھتا رہتا ہے۔ دونوں ملکوں کے بیچ مختلف شعبوں میں کبھی سرد تو کبھی گرم جنگ شروع ہو جاتی ہے۔ دونوں صورتوں میں دونوں ملکوں کے باشندے مختلف سطحوں پر یہ جھیلتے رہتے ہیں۔ خصوصاً وہ لوگ تو بری طرح ذہنی انتشار کا شکار ہوتے ہیں جن کے رشتے دار دونوں ملکوں میں ہیں۔ اس صورت حال کے سبب دونوں ملکوں کے درمیان سماجی اور خاندانی تعلقات روز بروز منقطع ہوتے جا رہے ہیں۔ ان پہلوؤں کی عکاسی ناول میں اس وقت ہوتی ہے جب زرینہ سلطان، پروین سلطانہ سے کہتی ہے:۔

"وہ زمانے لد گئے جب یہاں بر سر روزگار مسلمان لڑکوں کا قحط پڑ گیا تھا۔
بلکہ اب تو والدین اپنی لڑکیوں کو تمھاری طرف بھیجنا نہیں چاہتے۔ ویزا
پاسپورٹ کی دقتیں اور خدانخواستہ لڑائی چھڑ جائے تو راستے بند۔ نہ خط نہ پتر۔"

تقسیم ہند صرف جغرافیائی تقسیم نہ تھی بلکہ اس نے لوگوں کے اذہان و قلوب کو بھی منقسم کر دیا تھا اور شوہر اور بیوی کے تعلق وغیرہ کو بھی منقطع کر دیا تھا۔ تقسیم نے مطلقہ اور بیوہ عورتوں اور یتیم بچوں کو پورے برصغیر میں بکھیر کر اس المیے کو کافی دنوں تک جیتی جاگتی شکلوں میں زندہ رکھا۔ زرینہ سلطان اور اس کے تین بچے، علیمہ بانو اور خصوصاً چاندنی بیگم کے سماجی، معاشی اور نفسیاتی حالات ناگفتہ بہ ہیں۔ ان کے شوہروں اور والد کی بے رحمیوں اور بے وفائیوں پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ زرینہ سلطان کی گفتگو سے ان پہلوؤں کی وضاحت بخوبی ہو جاتی ہے:۔

"ان کے باپ کا کوئی فرض نہ تھا؟ طلاق تو مجھے دی تھی۔ بچے تو انھیں
کے تھے۔"

آزادی، قیامِ پاکستان اور اردو کو پاکستان میں قومی زبان کا درجہ ملنے کے بعد مسلمانوں اور اردو کو ہندستان میں مشکوک نگاہوں سے دیکھا جانے لگا اور یہ غلط فہمی ہندستان میں عام ہوتی گئی کہ قیامِ پاکستان میں اردو نے بھی اہم رول ادا کیا ہے۔ ان تمام نامساعد حالات کے باوجود تقسیم کے بعد بھی مسلمان اور اردو اپنے آبائی وطن میں رہے جو ان کا بنیادی حق تھا۔ تاہم ان کے ثقافتی اور لسانی انضمام کی کوششیں جاری رہیں۔ ان کوششوں میں ایک اہم کوشش یہ تھی کہ اردو رسمِ خط کو ختم کر دیا جائے اور اردو کو دیوناگری رسمِ خط میں لکھا جائے۔ ہندستان کی لنگوا فرینکا انگریزی کے علاوہ اگر کوئی زبان ہو سکتی ہے تو وہ ہندستانی ہے جو لفظیات کی سطح پر اردو سے زیادہ قریب ہے۔ اردو کے اس پھیلاؤ اور عوامی مقبولیت کی بہت سی وجوہ ہو سکتی ہیں جن میں فلم انڈسٹری کا رول بھی کافی اہم ہے۔ فلمی گانے اور کہانیاں بغیر اردو زبان کے بے جان ہیں۔

جوائنٹ فیملی دراصل جاگیردارانہ اور زمیں دارانہ سماج اور نظام کی خاصیت تھی۔ تحریک آزادی کے دوران اور اس کے بعد ہندستانی سماج اور نظام اور معیشت سرمایہ دارانہ

شکل اختیار کرتے گئے گرچہ محدود معنوں میں ہماری معیشت مخلوط رہی ہے جس میں صنعت کار تاجر اور پیشہ ور طبقے اُبھر کر سامنے آئے۔ اس طبقے کی بڑھتی ہوئی حیثیت نے دیہاتوں کو قصبوں اور قصبوں کو شہروں میں تبدیل کرنا شروع کیا۔ لوگ دیہاتوں سے قصبوں اور قصبوں سے شہروں کی طرف متوجہ ہوئے۔ اس نقل مکانی کے عمل نے اور بڑھتی ہوئی مادیت پسندی نے خاندانوں کی سالمیت کو منتشر کر دیا ہے جس سے نیوکلیر فیملی کا چلن ہوا۔ تاہم نقل مکانی اور مادیت پسندی کے میلان نے اندھی انفرادیت کو جنم دیا جس کی اہم خصوصیت خودسری اور خودمختاری ہیں۔ نتیجتاً سرمایہ دار ملکوں کے بڑے بڑے شہروں میں نیوکلیر فیملی بھی منتشر ہو رہی ہے اور اس کے منفی اثرات بھی منظر عام پر آرہے ہیں۔ ان پہلوؤں کی عکاسی بھی اس ناول میں ملتی ہے۔

ہندستان مخلوط آبادی کا ملک ہے جہاں مختلف اقوام کے لڑکوں اور لڑکیوں میں بہت زیادہ دوری دیکھنے کو نہیں ملتی۔ مسلم معاشرہ لڑکیوں کو بہت غیر محفوظ سمجھتا ہے اور ان کی آزادی کو مشکوک نگاہوں سے دیکھتا ہے۔ اسی لیے ان کی پرورش و پرداخت اور تعلیم و تربیت جنس مخالف سے دور رہ کر ہوتی ہے اور یہ تعلیم و تربیت صرف ایک مہذب، باصلاحیت اور قابلِ احترام خاتون بنانے اور ایک موزوں رشتے کی خواہش کے تحت ہوتی ہے۔ اس کے برخلاف مسلم لڑکوں کی تعلیم و تربیت کھلے ماحول میں ہوتی ہے جہاں مختلف اقوام کے لڑکے اور لڑکیاں کندھے سے کندھا ملا کر اپنی اپنی تعلیمی سرگرمیوں اور دیگر مہمات میں مصروف رہتی ہیں۔ اسی کھلی فضا میں رہ کر مسلم لڑکے کبھی کبھی غیر مسلم لڑکیوں کے ساتھ شادی کر لیتے ہیں جس کے کچھ سماجی اور نفسیاتی وجوہ ہوتے ہیں گرچہ وہ اپنی قوم کی لڑکیوں کو پسند کرتے ہیں تبرز علی اور روکی میاں کی شادیاں اسی طرف اشارہ کرتی ہیں۔

اس ناول میں اس سماجی پہلو پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے کہ آزادی کے بعد خاص طور پر مغربی تعلیم کے لیے انگلش میڈیم کے اسکول پورے برصغیر میں کھولے گئے جہاں مغربیت اور جدیدیت دونوں ساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔ انگریز اور انگریزی زبان کی بین الاقوامی افادیت اور اس سے مرعوبیت کانونٹ اسکولوں کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔

اس مغربیت اور جدیدیت کی لہر کے پس پشت کئی وجوہ ہو سکتی ہیں۔ بین الاقوامی سطح پر

انگریزی زبان کی افادیت مسلّم ہے۔ مختلف علوم و فنون کی کتابیں انگریزی میں بآسانی دستیاب ہیں۔ ایک بہت اہم وجہ یہ بھی ہے کہ اچھی نوکری حاصل کرنے کے لیے انگریزی کا جاننا ضروری ہے۔ انگریزی ہندستان میں لنگوافرینکا کا رول ادا کر رہی ہے اور مختلف علاقوں کے لوگوں کے درمیان رابطے کی زبان ہے۔ اس طرح یہ قومی سالمیت کا کام بھی انجام دے رہی ہے۔

قرۃ العین حیدر نے اس ناول میں دنیا کی بے ثباتی اور فلسفہ تناسخ کا ذکر قدرے ترشی اور تلخی کے ساتھ کیا ہے۔ وہ نامعلوم سمت کی طرف بڑھتی سماجی اقدار اور افراد کی مزاجی کیفیات پر کلبی (Cynical) نظر ڈالتی ہیں۔

انسان فطرتاً تبدیلی کو پسند کرتا ہے۔ اس کی فطرت میں ایک قسم کی بے اطمینانی ہے۔ اسی لیے وہ طرح طرح کی اشیا کی تلاش و جستجو اور ان کی فراہمی میں مصروف رہتا ہے۔ یہ جستجو بے اطمینانی اور ناآسودگی اس میں نت نئی خواہشیں پیدا کرتی رہتی ہے اور ان کی تکمیل کے لیے وہ مسلسل عملی کوششوں میں منہمک رہتا ہے۔ ناول میں ان کوششوں اور ان کے ممکنہ اثرات پر بھرپور روشنی ڈالی گئی ہے۔

قرۃ العین حیدر نے اس ناول میں اس موضوع پر بھی روشنی ڈالی ہے کہ جوان تعلیم یافتہ لڑکیوں کی نوکری کا مسئلہ خاصا پیچیدہ ہے کیوں کہ اگر وہ عفت و عصمت کے روایتی معیاروں کو ملحوظ رکھتی ہیں تو طرح طرح سے ان کو بلیک میل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے لیکن اگر وہ سودے بازی پر آمادہ ہو جاتی ہیں تو نہ صرف نوکری مل جاتی ہے بلکہ ترقی قبل از وقت اور بآسانی ہو جاتی ہے۔ اس طرح سے دونوں صورتوں میں ان کا استحصال ہوتا ہے۔ ہمارے معاشرے میں عام طور سے لڑکیوں کے ساتھ تعصب برتا جاتا ہے۔ والدین خصوصاً والد محترم ان کو بن بلایا مہمان سمجھتے ہیں۔ ان کو مشکوک نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ ان کی شادی کرا کے اپنے گھروں سے جلد از جلد رخصت کر دینا ہی والدین کا اوّل و آخر منصوبہ ہوتا ہے۔ ان کی تعلیم و تربیت، پرورش و پرداخت اور اپنے طور پر زندگی گزارنے کا اہل بنانے کے لیے کوئی خاص منصوبہ بندی نہیں کی جاتی۔ اپنے بے رحم اور بے وفا والد کے تئیں "چاندنی بیگم" کا معصومانہ رویّہ اس طرف واضح اشارہ بھی ہے اور والدین خصوصاً والد محترم کی عدالت میں

ایک منت بھری گزارش بھی ہے۔

قرۃ العین حیدر نے اس ناول میں جتنے موضوعات برتے ہیں وہ عصری زندگی سے تعلق رکھتے ہیں ان میں بین الاقوامیت بھی ملتی ہے۔ لیکن ان موضوعات کا براہ راست تعلق ہندستانی سماج اور سیاست سے ہے۔ ہپّی تحریک (Hippie Movement) جو 1960 کی دہائی میں امریکہ اور برطانیہ میں شروع ہوئی جس کے پس پشت، سماجی، سیاسی اور نفسیاتی وجوہ تھے۔ اس کے پیرو منظم معاشرے، مقبول سماجی عادات و اطوار اور معروف آداب و اصول کے باغی تھے۔ ان کے یہاں انفرادیت کا احساس شدید تھا وہ غیر رسمی آداب زندگی اور سوچ کو اپناتے تھے۔ اس تحریک کے اثرات کو ہندستانی معاشرے میں بھی محسوس کیا گیا جس کی جھلک اس ناول میں بھی ملتی ہے۔

اس ناول میں سابقہ سوویت یونین اور امریکہ کے درمیان دوسری جنگِ عظیم کے بعد شروع ہونے والی سرد جنگ کی طرف بھی اشارہ ملتا ہے۔ اگر کسی فرد کو نظریاتی انحراف کی وجہ سے اس کے اپنے ملک میں سیاسی مصائب سے دوچار ہونا پڑتا تو اس کو بہ آسانی دوسرے ملک کا ویزا مل جاتا تھا۔ لفٹ ونگ صحافی معراج احمد کو امریکہ کا ویزا مل جانے پر پنکی میاں کو اسی لیے تعجب ہوتا ہے کہ ان کی نظریاتی وابستگی کے پیش نظر ان کو سوویت یونین کا ویزا ملنا چاہیے تھا نہ کہ امریکہ کا۔

دنیا روز بروز ایک عالمگیر گاؤں کی شکل اختیار کرتی جا رہی ہے۔ انسان کی خواہشات اور ضروریات میں جس قدر اضافہ ہوتا جا رہا ہے اتنی ہی اس کی ذہنی بے چینی بڑھتی جا رہی ہے۔ ان گتھیوں اور پیچیدگیوں کو بخوبی سمجھنے اور انھیں حل کرنے کے لیے مخصوص مہارت اور لوگوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ ان سب کا حصول ایک ہی جگہ یا ایک ہی ملک میں نہایت مشکل ہے۔ اس لیے مختلف سطحوں پر لین دین ہوتا ہے۔ اور نتیجتاً انحصار کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ اس لین دین اور انحصار کی وجہ سے مختلف سطحوں پر رسل و رسائل اور ان ذرائع کا سہارا لیا جاتا ہے جن کی مدد سے ایک ملک سے دوسرے ملک میں آزادانہ آمد و رفت کو ممکن بنایا جا سکے۔ اس سے معاملات کی وسعت اور پیچیدگی اور بڑھ جاتی ہے کیوں کہ کسی مخصوص مذہبی یا نظریاتی جماعت کے لوگوں پر مختلف مذہبی یا نظریاتی گروہوں کے ظلم و زیادتی کے اثرات دور

رس ہوتے ہیں۔

قرۃ العین حیدر نے بڑھتی ہوئی بین الاقوامیت کے اثرات کو مختلف موضوعات کے حوالے سے واضح کیا ہے۔ اس نیلی اور فلسطینی مسئلے اور اس پر دنیا کے دیگر حصوں میں مقیم مسلمانوں کے ردِ عمل پر بہت اچھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اسرائیلی نژاد نصر اللہ داؤد جو طبعاً بہت شریف ہے، پریزادہ گلاب کی ماں کو بیمار پڑنے پر اپنی کار میں بٹھا کر ہسپتال لے جاتا ہے پریزادہ گلاب کو کسی طرح یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ نصر اللہ داؤد کا لڑکا اسرائیلی فوج میں سپاہی ہے، اس خبر سے اس کی مذہبیت اور قومیت بھڑک اٹھتی ہے۔ نتیجتاً اپنی ماں اور بہن بیلا شوخ کو سخت حکم دیتا ہے کہ نصر اللہ داؤد اور اس کے گھر والوں سے دونوں دور رہیں۔ بیلا شوخ قمر علی سے بیان کرتی ہے:۔

> "گلو بھائی نے اماں سے کہا تھا، اب داؤد بھائی کی ٹیکسی پر ہرگز مت بیٹھنا اور یہ بیلا کی بچی اگر ان کے ہاں گئی تو میں اس کی ٹانگیں توڑ دوں گا۔ وہ لوگ ہمارے دشمن ہیں۔"

آدمی ایک عجیب و غریب سماجی جانور ہے۔ اس کے مزاج، فطرت اور نفسیات کو بخوبی سمجھنا از حد مشکل کام ہے۔ وہ مختلف اوقات میں مختلف مقامات پر اور مختلف افراد سے مختلف برتاؤ کرتا ہے۔ اتنا ہی نہیں، وہ سوچتا کچھ ہے، کہتا کچھ ہے اور کرتا کچھ ہے۔ یعنی تمام تہیں افقی اور عمودی طور سے متضاد ہوتی ہیں۔ انسانی رشتے بھی بہت الجھے ہوئے ہیں۔ ایک طرف نفسیاتی رشتے تو دوسری طرف سماجی رشتے ہوتے ہیں۔ ایک طرف اقداری تو دوسری طرف مادّی رشتے ہوتے ہیں۔ ایک طرف علاقائی رشتے تو دوسری طرف قومی رشتے ہوتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ ان تمام رشتوں کو بخوبی نبھا لینا خاصا مشکل کام ہے جس کے لیے احساس کا مادّہ اور منصفانہ رجحان رکھنا نہایت ضروری ہے ورنہ انتشار آج نہیں تو کل ناگزیر نتیجے کی صورت میں سامنے آئے گا اور یہ انتشار بعض اوقات کسی خاص علاقے میں انسانی اقدار کو منتشر کر کے رکھ دیتا ہے۔ پھر انسان اور حیوان میں فرق مٹ جاتا ہے اور اس حیوانیت اور درندگی نے کتنے المیہ ڈرامے کھیلے ہیں، اندازہ لگانا مشکل ہے۔ اس حیوانی ڈرامے میں پہلے ہی سے ستائی ہوئی عورت ذات کو نسبتاً زیادہ مصائب کو جھیلنا پڑتا ہے۔ تقسیم ہند ہو یا تقسیم پاکستان،

ایک میں دو مذاہب کے لوگوں نے تو دوسرے میں دو علاقوں کے لوگوں نے ایک دوسرے کے اذہان و قلوب کو تقسیم کر کے خون کی ہولی کھیلی۔ ایسے ناگفتہ بہ حالات میں جوان لڑکیوں کو نہ جانے کتنے مشکل ترین امتحانات سے گزرنا پڑتا ہے۔

قرۃ العین حیدر نے اس ناول میں 1971 اور قیام بنگلہ دیش کے وقت کے سانحوں کی بھی مختصر جھلک دکھائی ہے۔ ان سانحوں میں وہی سب کچھ ہوا جو ہر ہنگامی صورتحال کی خصوصیت ہوتی ہے۔ لیلیٰ فردوس پنکی میاں سے بیان کرتی ہے:۔

"چچا میاں کو ستون سے باندھ کر ان کی آنکھوں کے سامنے ان کی بیوی اور بیٹیوں کو گولی مار دی تھی۔ دونوں جوان لڑکیوں کو اٹھا لے گئے فریدہ اور فرحانہ۔"

قرۃ العین حیدر نے بابری مسجد اور رام جنم بھومی کے پیچیدہ مسئلے کو بھی چھیڑا ہے اور اس کی جڑوں کا سراغ لگانے کی بڑی متوازن اور منصفانہ کوشش کی ہے۔ انھوں نے دکھایا ہے کہ عہدِ وسطیٰ کے جاگیردارانہ سماج میں مختلف اقوام و مذاہب میں پُر خلوص، بامقصد اور خوشگوار ہم آہنگی ملتی تھی۔ انھوں نے جذبات کی بجائے سمجھ بوجھ اور دلائل و براہین کی مدد سے پورے مسئلے پر منصفانہ انداز میں روشنی ڈالی ہے جو قاری کو تاریخی، سماجی اور سیاسی بصیرت عطا کرتی ہے۔ اقتدار کے بھوکوں نے حقیقت میں بھوکوں کو مشتعل کر کے اس مسئلے کو آتش فشاں کی شکل میں ڈھال دیا ہے جو جدید مملکت کے تصور، سرمایہ دارانہ نظام، جمہوری طریق انتخاب (Electoralism) اور عوامی اقتدار اعلیٰ کا اضافی منفی پہلو ہے۔

ان پہلوؤں کی وضاحت ذیل کے اقتباسات سے بخوبی ہو جائے گی:۔

"باغ کے دوسرے گوشے میں ندی کے رخ پیپل کا بوڑھا درخت تھا۔ اس کی جڑ میں کسی زمانے میں کسی نے ندی سے نکال کر ایک سیاہ گول پتھر نصب کر دیا تھا۔ گرداگرد لکھوری اینٹوں کا چبوترہ۔ منشی بھوانی شنکر، بھگوان دین اور پھنکو وہاں پوجا پاٹ کرتے۔"

معراج احمد پنکی میاں سے گفتگو کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"بات معمولی ہے، بے حد علامتی۔ سنئے ہم لوگوں نے ایک ریڈروز پارٹی بنائی تھی۔ اس

کے ٹکٹ پر قنبر میاں ایک الیکشن لڑے۔ درانتی کے اندر گلاب اور ہتھوڑا ہمارا نشان تھا۔ ہم
ہی نے اس کا بلاک بنوایا۔ پیتل کے دو سائن بورڈ برآمدے میں رکھے تھے۔ یہ لوگو تینوں
رسالوں کے سرورق پر بھی چھپتا تھا۔ برسوں بعد جب حمّاد ھوبی کو ہل چلاتے ہوئے وہ دونوں
پلیٹیں ملیں، انھوں نے مٹی سے نکال کر مسجد کی دیوار سے ٹکادیں۔ آج یہ بات ہمیں وہیں
معلوم ہوئی۔ اب جناب والا مندر والوں نے ایک تختی پر ہتھوڑا اور گلاب کھرچ کر درانتی کو
ترشول بنادیا ہے۔ دوسری پر سے مسجد کمیٹی والوں نے ہتھوڑا مٹا کر درانتی کو ہلال اور گلاب کو
ہشت پہلو ستارے کی شکل دے دی ہے۔"

مرحوم قنبر علی کے باغ میں اچھا خاصا ہجوم جمع ہو گیا۔ پنکی میاں جاکر لوگوں سے وجہ
دریافت کرتے ہیں تو جواب ملتا ہے:۔

"مہادیو گڑھی کا میلہ حجور۔"

"مہادیو گڑھی؟ وہ کہاں ہے؟"

"یہیں حجور جہاں آپ کھڑے ہیوں۔"

"یہ شیخ صاحب کی زمین ہے۔"

"ہمیں چودھری جی نے بتلایا کہ یہ مہادیو گڑھی ہے اور اس کے میلے کا آج شبھ آرمبھ
ہو گا۔ ہم لوگ دیہات سے آئے ہیں۔"

"یہ چودھری جی کون ہیں؟"

"ہمارے بلاک کے نیتا۔"

پنکی نے نظر دوڑائی۔ پیپل کے تین طرف کافی زمین گھیر کر سفید اینٹوں سے حد بندی
کرلی گئی تھی۔ ایک گوالے سے پوچھا۔ "یہ مندر کب بنا؟"

"پراچین کال میں حجور۔"

دوسری سمت نگاہ کی۔ غربی گوشے میں مسجد کے تین طرف اسی قسم کی
اینٹیں چن دی گئیں تھیں۔"

قرۃالعین حیدر نے آزادی کی صبح سے لے کر ناول کے شائع ہونے تک یعنی 1990
تک کے تقریباً تمام اہم سماجی، ثقافتی اور سیاسی مسائل اور ان کی پیدا کردہ صورتحال کا ناقدانہ

جائزہ فلسفہ تسلسل و تبدل کی مدد سے لیا ہے۔ جاگیر دارانہ سماج اور نظام اقدار کے رفتہ رفتہ مٹنے اور سرمایہ دارانہ سماج اور نام نہاد (نئی) اقدار کے ابھرنے کی عکاسی کی گئی ہے۔ ان کے لیے جو چیز سب سے زیادہ تشویشناک ہے وہ ہے پرانی اقدار کا روز بروز مٹنا اور نئی نام نہاد اقدار کا منظر عام پر ظہور ہونا۔ کیوں کہ نئی اقدار کی بنیاد گھناونی مادیت اور وحشیانہ انفرادیت پر ہے جس میں انسانیت کے مقابلے میں حیوانیت کی بو، زیادہ ملتی ہے۔ آزادی کی صبح سے لے کر آج تک ہندستانی معاشرے کے کسی بھی شعبے کا ناقدانہ جائزہ لیں تو ہر کسی کو بخوبی یہ محسوس ہو جائے گا کہ جو بھی تبدیلی رونما ہوئی ہے اس میں ترقی کے مقابلے میں تنزل کا پہلو زیادہ ہے۔ مختلف سطحوں پر بدعنوانی، انتشار اور لایقینیت کو صاف دیکھا اور محسوس کیا جا سکتا ہے آج تک کوئی مستحکم، دور رس سماجی اور سیاسی منصوبہ نہیں تیار کیا گیا جو ٹھوس اور مستحکم قومیت کے لیے اشد ضروری ہے۔ جس میں ہر طبقے، علاقے اور فرقے کو منصفانہ انداز نظر سے دیکھا گیا ہو اور حقوق و فرائض کا تعین کیا گیا ہو۔ کیوں کہ ہماری سیاست اور ہمارے سیاست کار ملک کے ہر علاقے، طبقے اور ہر فرقے میں شک اور نفرت کے بیج بوتے رہے ہیں۔ اقتدار کی بھوک کے ماروں نے صرف اور صرف ووٹ کی سیاست کو اہمیت دی ہے۔ ہندستان کا آئین ہندستانی معاشرے کے لیے ایک کارگر صحیفہ ہو سکتا ہے تاہم اس کی حیثیت عملی سطح پر آثار قدیمہ سے زیادہ نہیں ہے۔ اس بے یقینی، بے اطمینانی، بدعنوانی اور باہمی عدم اعتماد کی صورت حال کا کم و بیش ہر کوئی ذمے دار ہے۔

متروکہ زمینوں کو ہتھیانے کے رواج اور اس کے ذرائع پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ بابری مسجد اور رام جنم بھومی مسئلے پر ہلکی سی روشنی ڈالنے کے بعد مس حیدر نے مختلف مسائل میں سیاست کاروں کے رول پر بھی حقیقت پسندی اور مایوسی کے ساتھ اظہار خیال کیا ہے۔ سطحی مذہبیت نہ صرف متنازعہ اور متروکہ زمینوں کو ہتھیانے کا ایک مؤثر ذریعہ بن گئی ہے بلکہ موجودہ معاشرے میں شہرت، عزت، اقتدار اور اثر و رسوخ حاصل کرنے کا بھی ایک کارگر ہتھیار بنتی جا رہی ہے۔ اس طرح ہندستان جو اب تک جس بھی نوعیت کا سیکولر ملک تھا، اس کی حالیہ سیاسی اور سماجی صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ کچھ سے کچھ ہوتا جا رہا ہے۔ عوام اور مذہب کا استحصال کرنے کے لیے رجعت پسند سیاسی پارٹیاں اور ثقافتی تنظیمیں

معرضِ وجود میں آ گئیں ہیں ان سبھی پہلوؤں کی عکاسی پنکی میاں اور معراج احمد کی گفتگو سے ہوتی ہے:۔

"پنکی میاں ہماری لگائی ہوئی گلاب باڑی گدھے چر گئے۔"

"آپ لوگوں نے کھاد صحیح نہیں ڈالی تھی۔ ورنہ آج چالیس سال بعد یہ اسّی نوّے کروڑ کی آبادی روز بروز مزید کنفیوژن میں غرق نہ ہوتی۔"

"بھڑوں کا چھتہ محض ہماری غلطیوں کی بدولت تیار نہیں ہوا۔ پنکی میاں ہم جب سے وطن لوٹے ہیں آپ کی اس مقامی صورتِ حال کو بھی اسٹڈی کر رہے ہیں۔ گوالوں گھوسیوں نے تو شیخ طاہر علی کی اینٹی بنوادی۔"

"معراج احمد پرانے علیگ تھے، لیکن پنکی میاں آپ نے بلڈوزر چلوانے میں جلدی کی۔"

"وہ ملکی سیاست کے بڑے معاملات تھے قبلہ۔ یہ ایک نہایت لوکل، ایک شخص کی نجی جائیداد پر انکروچمنٹ کا معمولی سا واقعہ ہے رفع دفع ہو جائے گا۔"

"جی نہیں۔ لیڈر رائی کا پربت بنا سکتے ہیں ادھر رام جنم بھومی اور بابری مسجد۔"

"اوہ نو — نوٹ دیٹ اگین۔ معراج صاحب اس کے متعلق سنتے سنتے۔"

"یہ بھی عبادت گاہوں کا معاملہ ہے پنکی میاں۔ زمینوں پر ناجائز قبضے کا آج کل سہل ترین نسخہ۔ ایک چھوٹا سا مندر یا ایک پتھر پر چونے سے لکھا ہوا کسی پیر کا نام اور چاند تارے کا جھنڈا — گویا — گویا ان بزرگ کا چلہ۔"

"رائٹ ونگ پارٹیاں اس جھگڑے میں پھاند پڑی ہیں۔"

مسلم فرقے کی قیادت نااہل اور غیر سنجیدہ سیاست کاروں کے ہاتھوں میں ہے جن پر موجودہ مایوس کن صورت حال کی ذمّے داری عائد ہوتی ہے۔ بدعنوان سیاسی پارٹیوں کی طرح یہ بھی مسلم فرقے کا اپنے سیاسی مفاد کے لیے استحصال کرتے ہیں۔ الیکشن یا ہنگامی حالات کے وقت نعرے بازی کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ مسلمانوں کی تعلیمی، سماجی اور معاشی فلاح و بہبود کے لیے ان کے پاس کوئی پروگرام نہیں نہ وہ صورت حال میں کسی مثبت تبدیلی کے خواستگار ہیں۔ لیلیٰ فروش اپنے والد طاہر علی سے دوران گفتگو کہتی ہیں:۔

"آپ بھی ہندستان کے بہت سے مسلم لیڈروں کی طرح موجودہ
پچویشن بر قرار رکھنا چاہیں گے ورنہ آپ کی قیادت خطرے میں پڑ جائے گی۔"

یہ بات ہر کسی کو بخوبی معلوم ہے کہ ہندستان کے تقریباً ہر بڑے شہر میں فرقہ وارانہ فساد ہوئے یا کرائے گئے۔ فرقہ وارانہ فساد ہندستان جیسے بڑے ملک میں جہاں مختلف قومیں اور فرقے آباد ہیں، بعید از قیاس نہیں لیکن اس میں حکومت وقت اور مختلف سیاسی پارٹیوں کا رول قابلِ غور ضرور ہے۔ آزاد ہندستان نصف صدی، کا طویل سفر طے کرنے کے بعد بھی کھینچ تان کر ترقی پذیر ممالک کے گروپ میں آتا ہے۔ چین جو ہم سے دو سال بعد وہاں کے نام نہاد نیشنلسٹوں کے شکنجے سے آزاد ہوا، امریکہ کا مختلف میدانوں میں مقابلہ کر رہا ہے۔ اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ فرقہ وارانہ فساد سے قبل، دوران اور اس کے بعد پورا ہندستانی معاشرہ تخریبی سمت میں سوچنے اور برتاؤ کرنے لگتا ہے جو ہماری پس ماندگی کے پس پشت وجوہ میں سے ایک اہم سبب ہے۔ حکومت بنگال کی اس فرنٹ پر مس حیدر نے ستائش کی ہے کیوں کہ بنگال میں مارکسی حکومت نے اس فرقہ وارانہ مہاماری پر کنٹرول کر لیا ہے۔ معراج احمد لیلیٰ فروش سے ان کے صوبے کی حکومت کی اس موضوع پر تعریف کرتے ہیں:۔

"لیکن بی بی"، معراج احمد بولے۔ "ہم خوش ہیں کہ آپ کے ہاں درانتی
اور ہتھوڑے کی سرکار نے کم از کم ایک قسم کی مار اماری تو ختم کروادی۔"

ناول میں قرۃ العین حیدر نے انسانی جبلّت پر بھی بڑی ناقدانہ روشنی ڈالی ہے۔ اس بے چین اور حرکاتی جبلّت کو بیشتر کرداروں میں واضح طور پر محسوس کیا جاسکتا ہے۔ انسانی بے اطمینانی، نا آسودگی اور تجسّس دنیا کی تمام تبدیلیوں کا باعث ہے۔ انسان کی سرشت میں تبدیلی کی خواہش ہے۔ انسان اقتدار اور اثر ورسوخ کا بھوکا ہوتا ہے۔ اقتدار کی مختلف قسمیں اور نوعتیں ہیں جن سے وہ دوسرے افراد پر مختلف طرح سے حکومت کرنا چاہتا ہے اور دوسروں سے اپنی بات اور مختلف حیثیتوں کو قبول کروانا چاہتا ہے۔

ہندستان میں جاگیردارانہ سماج اور نظام کا انہدام تو جدوجہد آزادی کی شروعات کے ساتھ ہی شروع ہو چکا تھا، صبح آزادی کے وقت کانگریس کے منشور کے مطابق اس کے باقاعدہ انہدام کا حکومتی اعلان ہوا۔ تاہم بڑے بڑے زمیں دار اور ان کی زمیں داری حقیقتاً

بر قرار رہی۔ رفتہ رفتہ اس صورتِ حال میں تبدیلی تو آئی لیکن زمیں دار اپنی زمیں داری اور زمیں دارانہ ذہنیت سے چپکے رہے۔ ابھرتے ہوئے سرمایہ دار اور پیشہ ور طبقے کے رویے سے انھوں نے استفادہ نہیں کیا۔ نتیجتاً سرمایہ دار اور پیشہ ور طبقے کے افراد جن میں روایتی ادنیٰ طبقے کے لوگ پیش پیش تھے، اپنی مالی حالت کی بنیاد پر معاشرے میں اہمیت حاصل کرنے لگے۔ اس بدلتی ہوئی صورتِ حال کا زرینہ سلطان کے اظہار خیال سے پتہ چلتا ہے:۔

"پہلے زمینداروں میں تعزیوں کا مقابلہ ہوتا تھا۔ سب سے اونچا تعزیہ
جلوس میں سب سے آگے۔ پیسہ اب قصائیوں، جولاہوں کے پاس آگیا ہے۔
اونچے سے اونچے تعزیے کا کمپیٹشن ایک دوسرے سے وہ کررہے ہیں۔"

معاشرے میں ہر سطح پر بڑھتی بے یقینی، بدعنوانی، ظاہر و باطن کے تضاد اور انسانی اقدار کے انتشار کی وجہ سے مس حیدر اشرف المخلوقات کی شرافت سے بری طرح مایوس لگتی ہیں۔ انسان اندرونی طور سے جانوروں سے مماثل ہے۔ آدمی کو انسان بنانے اور بنائے رکھنے کے لیے دنیا کے تقریباً تمام خطوں میں بے شمار پیغمبر بھیجے گئے۔ تاہم اس کی اندرونی وحشیانہ جبلت اور باہر کی اختیار کی ہوئی انسانی اقدار میں بعض اوقات اور حالات میں کش مکش بڑھ جاتی ہے اور اس کی اندرونی وحشیانہ جبلت، باہر سے انسانی اقدار پر حاوی ہو جاتی [illegible] وہ سب کچھ معرضِ وجود میں آتا ہے جس کا ہم آسانی [illegible] نہیں کر سکتے۔ غالب نے کہا ہے:

بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

قرۃ العین حیدر بھی کچھ اسی طرح کے تاثرات کا اظہار کرتی ہیں۔ ان کا اظہار کہیں طنزیہ اور کہیں معصومانہ ہے۔ انسان کے اشرف المخلوقات ہونے کے باوجود اس کو صراط مستقیم پر لانے کے لیے پیغمبروں کی ضرورت پڑتی ہے جبکہ چرند پرند کے لیے ایسی ضرورت پیش نہیں آتی۔ لیلیٰ فروش کے مختصر رد عمل سے اس بات کی وضاحت ہوتی ہے:۔

"وکی ماموں کہتے ہیں پرندوں میں بھی پیغمبر آتے ہوں گے۔ انھیں
پیغمبروں کی ضرورت نہیں۔" لیلیٰ نے پلکوں پر انگلیاں پھیریں۔ "میں جنگلوں

میں رہی ہوں۔"

قرۃ العین ہندستانی معاشرے میں تیزی سے رونما ہونے والی تبدیلیوں پر بڑی دوررس ناقدانہ نظر ڈالتی ہیں۔ ان کے پس پشت کارفرما محرکات اور ان کے زیر اثر رونما ہونے والے اثرات کو منطقی طریقے سے پیش کر کے انھوں نے قارئین کو سماج کے روز بروز تبدل اور اس کی ترقی پذیری کی بصیرت عطا کی ہے۔ انسان نے ابلاغ و ترسیل کے میدان میں بڑی ترقی کی ہے جس سے دنیا کے مختلف حصوں میں رہنے والے ایک دوسرے سے سیکنڈوں میں رابطہ قائم کر سکتے ہیں نئے ذرائع ترسیل میں ٹیلی ویژن بھی ایک بہت ہی دلکش آسان ذریعہ ہے جس کا تعلق ہماری سماعت اور بصارت دونوں کے ساتھ ہے ماضی میں ہندستان کے مختلف علاقوں میں جو تفریحی پروگرام ہوتے تھے، ان کے دن پورے ہوتے جارہے ہیں، ان پہلوؤں کی بھی عکاسی ناول میں ملتی ہے۔ عبدالکریم باجی کو بائیسکوپ دکھانے کے سوال پر گلاب سے کہتا ہے:۔

"تم ٹرائی مارو۔ منافع ففٹی ففٹی۔ آج کل گاؤں کا بالک بھی ٹیلی ویژن دیکھتا ہے۔ بارہ من کی دھوبن نہیں دیکھتا۔"

پورے ملکی نظام میں بدعنوانی اور خویش پروری سرایت کر گئی ہے۔ اس وجہ سے علمی دنیا میں تحقیقی جذبے کی کمی، بے توجہی اور بے اطمینانی آتی جارہی ہے۔ اس صورتِ حال میں پی ایچ ڈی اور پی ایچ ڈی اسکالر کی مجموعی وقعت روز بروز گھٹتی جارہی ہے۔ اس علمی گراوٹ اور منفی میلان کی طرف مس حیدر نے اشارہ کیا ہے۔ صفیہ سلطان اس علمی گراوٹ اور منفی میلان سے بیزار ہے۔ شہلا اس کی بیزاری کو ارشد حسین سے ظاہر کرتی ہے:۔

"علاوہ ازیں ان کا کہنا ہے کہ آج کل پی ایچ ڈی ٹکے سیر ہو گئے ہیں۔"

اس ناول میں تبدل پذیر اور متحرک معاشرے کی اقدار جو مائل بہ زوال دکھائی دیتی ہیں، فلسفہ تسلسل و تبدل کی مدد سے پیش کی گئی ہیں۔ ہر نئی جنریشن کی سوچ، خواہشات، مزاج اور ضروریات کا پہلی جنریشن کے مقابلے میں مختلف ہونا لازمی ہے۔ کسی ایک شے سے چاہے وہ کتنی ہی خوبصورت یا کارآمد ہو انسان مطمئن نہیں رہ سکتا اور یہی بے اطمنانی، ناآسودگی تمام تبدیلیوں کی وجہ ہے۔ جاگیردارانہ اور زمیں دارانہ سماج اور نظام اقدار اور اس

کے رکھوالوں اور ابھرتے ہوئے سرمایہ دارانہ سماج اور نظام و اقدار کے مظاہر اور ان کے پیروکاروں کے درمیان سرد ٹکراؤ کے عبوری دور کی بڑی دلکش عکاسی دیکھنے کو ملتی ہے۔

"اس پُر فضا علاقے کے بیشتر بنگلے منہدم کیے جا چکے تھے۔ان کی جگہ اپارٹمنٹ بلاک اور دفاتر تعمیر ہو گئے تھے۔ادھر دیکھو مسٹر ٹائیر بھائی ہاتھی والا۔ قلی بھی تمام پرانے بنگلو گرانے پر جھکا ہوا ہے۔ پر ہم نے بول دیا ہے۔ شیریں کاسل کو ہاتھ نہ لگانا۔ تم اس کا سنٹی مِنٹل ویلیو نہیں سمجھ سکتا۔"

"اوہ ممی۔!اس علی بابا کے غار میں کب تک رہے جاؤ گی۔"

کہا جاتا ہے کہ خالی دماغ شیطان کا گھر ہوتا ہے۔اس لیے اپنے دل و دماغ کو تعمیری کاموں میں مصروف رکھنا چاہیے۔ لیکن مواقع اور ذرائع کا مہیا کرنا صرف فرد کی ذمّے داری نہیں بلکہ مواقع،ذرائع اور سازگار ماحول کا پیدا کرنا حکومت وقت اور پورے معاشرے کا بھی فریضہ ہے ہمارے ملک اور معاشرے میں غربت وافلاس جہالت اور بے روزگاری کے سبب طرح طرح کے غلط کام ہوتے ہیں مضحکہ خیز توہمات و عقائد اور ان کے پیروکار ہر علاقے اور طبقے میں دکھائی دیتے ہیں۔مارکس نے جب یہ کہا تھا کہ:۔

"Religion is th heart of a hear less world. It is the opium of the people." تو اس کے یہ الفاظ انھیں توہمات اور اندھے عقائد کے لیے تھے اس معاشرتی پہلو کی بھی عکاسی اس ناول میں ملتی ہے:۔

"آیئے مہربان،قدردان بھائی جان،ماتا جی،دیدی چاچا۔
فلم اسٹاروں کے ذاتی اسٹرولوجر، مشہور جیوتشی،پامسٹ،عامل،پروفیسر سامری آف بومبے۔ مقدمے میں کامیابی۔ محبوب سے ملاقات۔ مطلوب سے شادی۔ دشمن کی بربادی۔ دھندا بیوپار۔ ابودھابی میں روزگار۔ پانچ روپے۔ صرف پانچ روپے۔"

"ٹھیک صبح چار بجے پنڈت پوتھی بانچ کر چلات ہیں پچکالگ گوا۔ پنچھتروں میں جھگڑا ہو گوا۔ بیاہ اگلے سال۔ یہاں بھی یہ سب ہوت ہے۔ بنارس کے پنڈت آن کر پوتھی بچارتے ہیں۔ صبح چار بجے پچکالگ جات ہے۔"

کش مکش اور چشمک انسانی نفسیات میں ہے۔ دنیا کے کسی بھی کونے میں جائیں جہاں انسان بستے ہیں، ان نفسیاتی پہلوؤں کا ملنا ناگزیر ہے۔ ان کی مختلف قسمیں ہوتی ہیں۔ جیسے علاقائی کش مکش، قومی کش مکش، ملکی کش مکش، صنعتی کش مکش، مذہبی کش مکش اور لسانی کش مکش وغیرہ وغیرہ۔ ان کی بھی مختلف نوعیتیں ہوتی ہیں۔ ان کے مختلف پس منظر اور وجوہ ہوتے ہیں۔ دراصل انسانی نفس میں خودی، خود پسندی اور خود ستائی پائی جاتی ہے۔ ان کی شدّت اور ذرائع اظہار کی نوعیت میں فرق ہو سکتا ہے۔ انسان دراصل جوں ہی انفرادی زندگی سے اجتماعی زندگی میں قدم رکھتا ہے اپنے اور غیروں کے بیچ شعوری تو کبھی لاشعوری طور پر تقابلی مطالعہ کرنے لگتا ہے۔ نتیجتاً فرق کا ابھر کر سامنے آنا لازمی ہے جس کی وجہ سے صبر و تحمل اور انکساری کی کمی کی صورت میں انسان کے مزاج میں احساس کمتری، احساس برتری اور امارت پرستی کا جنم ہوتا ہے۔ ان نفسیاتی پہلوؤں کو کھل کھیلنے کا موقع اس وقت ملتا ہے جب تعلقات ناساز گار ہوں۔ تقسیم ہند اور قیام پاکستان کچھ اہم بنیادی اختلافات کا نتیجہ تھے۔ تاہم تشویشناک بات یہ ہے کہ آج تک اس المیے نے دونوں ملکوں کی اجتماعی نفسیات کی باقاعدہ کتھارسس نہیں کی ہے۔ اسی لیے کبھی سرد تو کبھی گرم کش مکش مختلف سطحوں پر دیکھنے کو ملتی ہے۔ ان مختلف کش مکشوں اور احساس تشخص کی بڑی دلچسپ عکاسی اس ناول میں کی گئی ہے:۔

"پروین اپنے کمرے سے نکلیں، کرسی پر بیٹھ کر چند پرانے جوڑوں کا جائزہ لیا۔

"اماّں حوا کے زمانے کا سامان: ہمارے ہاں تو کپڑے تین چار بار پہنے اور گٹھری میں باندھ کر پھاٹک پر رکھ دیتے ہیں۔ جو چاہے اٹھا کر لے جائے یا غریب رشتے داروں کے لیے انڈیا لے آتے ہیں۔"

"شناخت اور تشخص تمھارا بڑا پرابلم ہے۔" پنکی میاں نے کہا۔ "ہم لوگ تو پہلے جو پہناوا پہنتے تھے وہی اب بھی پہنتے ہیں۔ ہماری طرزِ معاشرت میں کوئی ہوشربا انقلاب نہیں آیا۔"

"یار پنکی شناخت تمھارا ابھی تو مسئلہ بن گیا ہے جس نوجوان کو دیکھو چہرے پر داڑھی اور برقعے ہی برقعے۔"

ناول میں ایک اور سماجی منظر کی بھی جھلک ملتی ہے وہ ہے مسلمانوں کا عرب ممالک میں جاکر روزی کمانا اور اس ذریعہ آمدنی سے مسلم معاشرے میں بحیثیت مجموعی غضب کی تبدیلی۔ ویسے تو ہندستان کے مختلف علاقوں کے لوگ عرب ممالک گئے روزی کمائی اور اپنی سماجی، تعلیمی اور معاشی حیثیتوں میں کافی تبدیلی لائے۔ لیکن کیرالا کے لوگ اس میں پیش پیش رہے۔

"72 سے آج تک کیرالا میں گلف کی آمدنی سے بے شمار دینار ہاؤس اور ہزاروں ہزار مسجدیں بن گئیں۔ ان میں کتنی سہ منزلہ اور ایر کنڈیشنڈ۔ برائے حق العباد شفاخانے اور مدرسے بھی۔"

علاوہ ازیں بمبئی میں چالوں اور کھولیوں میں رہنے والوں کی زندگی کی عکاسی، فلمی دنیا کی اندرونی اور بیرونی جھلکیاں، اردو زبان وادب کی دیار غیر میں شہرت اور مقبولیت، امریکہ میں چکوتراگڑھوالی جیسے ہندستانی دیوتاؤں کا تعارف، میلوں اور درگاہوں کی تصویر کشی، ہندو مسلم تعلقہ داروں اور زمیں داروں کے مستحکم اور خوشگوار تعلقات اور ان کے گھروں کی فضا اور ماحول کی عکاسی، ان کی خاداؤں اور ملازموں کے عادات و اطوار اور لب و لہجہ وغیرہ، اندرا گاندھی کا غریبی ہٹاؤ کا نعرہ اور جی. ایل. ایف جیسے نسلی مسائل اور اختلاف وغیرہ کی بھی عکاسی اس ناول میں ملتی ہے۔

ناول کی شروعات میں ایک طرف قاری کو متوجہ کرنے کی پوری کوشش ہے تو دوسری طرف فلسفہ حیات اور جدید معاشرے کی حرکت پذیری کی عکاسی ملتی ہے۔ کہانی نو آبادیاتی دور کے لکھنؤ سے شروع ہوتی ہے۔ شیخ اظہر علی ایک مشہور و مقبول، خوش مزاج اور دولتمند بیرسٹر ہیں۔ ان کی کوٹھی لب دریا ہے جس سے متصل ایک باغ ہے، جس کے ایک کونے میں چھوٹی سی مسجد اور دوسرے کونے میں پیپل کا درخت ہے جس کی جڑ میں کسی زمانے میں کسی نے ایک گول پتھر رکھ دیا تھا جہاں منشی بھوانی شنکر سوختہ اور دو ملازم بھگوان دین اور پھنکو پوجا پاٹ کرتے ہیں۔ مندر مسجد کا یہ خوشگوار سنگم ایک مخصوص سماج اور اس کی اقدار کی نشاندہی کرتا ہے۔ آگے چل کر یہ بابری مسجد اور رام جنم بھومی کے مسئلے کی طرف علامتی اشارہ بھی کرتا ہے اور دوسرے مخصوص سماج اور اس کی اقدار کی نشاندہی کرتا ہے۔

شیخ اظہر علی کا اکلوتا لڑکا قنبر علی اپنے والد سے ذہنی اور مزاجی طور سے مختلف ہے گرچہ انھیں کی طرح وہ بھی وکالت پڑھتا ہے۔ وہ مارکسسٹ اور ترقی پسند خیالات اور نظریات میں یقین رکھتا ہے۔ اس کی زبان میں لکنت ہے۔ وہ سیاست میں قدم رکھنا چاہتا ہے۔ لکنت کو دور کرنے اور سیاست میں کامیاب ہونے کے لیے اسٹوڈنٹس یونین کے الیکشن میں تقریریں جھاڑتا ہے۔ اس کی ماں بدرالنسا ایک متوازن، روشن خیال اور ہمدرد مشرقی خاتون ہیں۔ حقوق نسواں کے حصول کی خاطر جدوجہد ان کا اہم مشغلہ ہے جس کے لیے وہ اچھا خاصا وقت دیتی ہیں۔ مختلف کانفرنسوں میں شرکت کرتی ہیں اور ریڈیو پر مذکورہ موضوع پر تقریریں کرتی ہیں۔ لیکن اپنے تمام جدید خیالات و نظریات کے باوجود مشرقیت کے لباس میں خوبصورتی کے ساتھ ملبوس ہیں۔ مفلسوں اور کمزور طبقے کے لوگوں کے ساتھ اچھا سلوک کرتی ہیں۔

اسی علاقے میں ایک دوسرا خاندان راجہ انوار حسین کا ہے۔ بیرسٹر اظہر علی اور راجہ انوار حسین کا خاندان ندی کے دو کناروں پر آباد ہے۔ راجہ انوار حسین ناول کے پردے پر کبھی نہیں آتے۔ ان کی بیوی رانی صولت زمانی اپنے نام کی خصوصیت اپنی شخصیت میں رکھتی ہیں۔ ان کے کردار میں مطلق العنانیت اور جاگیردارانہ سماج کی دیگر خصوصیات ملتی ہیں۔

راجہ انوار حسین کے دو بیٹے اور تین بیٹیاں ہیں۔ ایک بیٹے وقار حسین عرف وکی میاں جو ولایت کے تعلیم یافتہ ہیں، وہیں سے میگی نام کی ایک ادنیٰ درجے کی لڑکی سے شادی کر کے آتے ہیں جو بعد میں زنخوں کے ساتھ بھاگ جاتی ہے۔ نتیجتاً پہلے ہی سے نہایت حساس وکی میاں ذہنی اور قلبی طور سے منتشر ہو جاتے ہیں اور ایک صوفیانہ قسم کی زندگی گزارنے لگتے ہیں۔

راجہ انوار حسین کے دوسرے بیٹے ابرار حسین عرف بولی میاں ایک لاپرواہ مگر کینہ پرور کردار ہیں۔ وہ نہیں چاہتے کہ ان کے بڑے بھائی وکی میاں کی دوبارہ شادی ہو تاکہ موروثی جائداد ان کے قبضے میں آجائے۔

راجہ انوار حسین کی تین بیٹیاں زرینہ سلطان، پروین سلطان اور صفیہ سلطان ہیں۔ زرینہ عرف جینی کے شوہر قیام پاکستان کے وقت تین بچوں پنکی میاں، شہلا اور آمنہ کو چھوڑ

کر پاکستان چلے جاتے ہیں۔ تینوں بچوں کی تعلیم و تربیت کی ذمے داری زرینہ کے کندھوں پر آجاتی ہے۔ پروین سلطان کی شادی پاکستان میں ہوتی ہے۔ ان کے دو بچے فیروزہ اور ذکی میاں ہوتے ہیں۔ پروین اور زرینہ کے بیچ ملکی اور ثقافتی کش مکش دیکھنے کو ملتی ہے۔ سب سے چھوٹی بیٹی صفیہ سلطان کی شادی بچپن ہی میں قمر علی سے طے ہو جاتی ہے۔ وہ بہت حسین اور اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے۔ لیکن پولیو کی بیماری کی وجہ سے بائیں ہاتھ سے معذور ہے۔ قنبر علی اپنی نظریاتی وابستگی کی وجہ سے بچپن میں طے شدہ نسبت سے انکار کر دیتے ہیں۔ ان کے ترقی پسند نظریات صفیہ سلطان جیسی امیر زادی سے شادی کی اجازت نہیں دیتے۔ صفیہ جو قمر علی سے معصومانہ اور خاموش عشق کرتی ہے، بری طرح بیزاری کا شکار ہوتی ہے جس کی وجہ سے اس کے مزاج میں ترشی اور صوفیانہ پن کی خاصیت پیدا ہو جاتی ہے۔

قمر علی کی طرف سے صفیہ سلطان سے شادی کے انکار کے بعد ان کی ماں بدر النسا اچھے رشتے کی تلاش میں ہیں۔ قنبر علی اپنے والدین کی مالی مدد سے میگزین ریڈ روز شائع کرتے ہیں، باہر کی دنیا میں کچھ زیادہ ہی مشغول ہیں۔ ان کی ماں کو شبہ اور تشویش ہوتی ہے کہ کہیں وہ کسی غیر مسلم کے چکر میں نہ پھنس جائیں۔ اسی دوران ایک روز قنبر علی، شربری کے ساتھ جو ماڈرن انگلش ادب پڑھاتی ہے، پریس چلے جاتے ہیں جو ان کی ماں کو معلوم ہو جاتا ہے اور ایک روز وہ اتفاقیہ طور پر عورتوں سے متعلق کچھ عقائدی رسوم کے تئیں شربری کے خیالات کا ذکر اپنے والدین سے کرتے ہیں تو بدر النسا محسوس کرتی ہیں کہ قمر علی کی شادی جلد از جلد کر دی جانی چاہیے۔ وہ قمر علی سے ان کی پسند جاننے کے بعد اپنے میکے ظفر پور جاتی ہیں جہاں ان کی ایک سہیلی علیمہ بانو رہتی ہیں۔ ان کے شوہر ان کو چھوڑ کر پاکستان جا چکے ہیں۔ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور نہایت خوددار خاتون ہیں اور کالج میں پڑھاتی ہیں۔ اپنے ہی بل بوتے پر اپنی اکلوتی لڑکی چاندنی بیگم کو اعلیٰ تعلیم و تربیت دیتی ہیں۔ بعد میں چاندنی بھی اسی کالج میں پڑھانے لگتی ہے۔ وہ خوبصورت اور نیک سیرت مذہبی لڑکی ہے۔ محنت اور لگن سے پڑھ پڑھ کر اپنی بصارت خراب کر لیتی ہے۔ نتیجتاً موٹا سا چشمہ لگانے لگتی ہے۔ بدر النسا چاندنی بیگم کی تعلیم و تربیت، خوبصورتی اور نیک سیرتی سے متاثر ہو جاتی ہیں اور قنبر علی کی تمام شرطوں کو چاندنی بیگم کے کردار میں موجود پاتی ہیں اور اپنے بیٹے قنبر علی کی شادی

چاندنی بیگم سے طے کر دیتی ہیں۔

اسی اثنا میں بدرالنسا خواتین کی عالمی کانفرنس میں شرکت کرنے جینوا جاتی ہیں۔ وہاں سے واپسی پر اپنے شوہر کو مفلوج پاتی ہیں جو چھ مہینے کی بیماری کے بعد اس دنیائے فانی کو خیر باد کہہ دیتے ہیں۔ اس کے بعد بدرالنسا اپنے شوہر کے غم میں بجھ کر رہ جاتی ہیں۔ بیٹے کی شادی کا کچھ دن تک خیال ہی نہیں آیا۔ عدّت پوری کرنے کے بعد بھائیوں سے ملنے ظفر پور جاتی ہیں جہاں ان کو معلوم ہوتا ہے کہ ان کے بھائی بھی ان کو چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے پاکستان چلے گئے۔ شوہر کے انتقال کا غم ابھی تازہ تھا دوسرا غم بھائیوں کی ہجرت کا۔ آہ و گریہ کرتے کرتے دنیا سے کوچ کر جاتی ہیں۔

اس کے بعد ترقی پسند قنبر علی اپنے خیالات کی اشاعت اور عزائم کے حصول کے لیے باقاعدہ صحافت اور سیاست میں قدم رکھتے ہیں۔ پہلے ریڈ روز انگریزی میں شائع ہوتا تھا اب اردو اور ہندی میں بھی گل سرخ اور لال گلاب کے ناموں سے ایک ساتھ شائع ہونا شروع ہوتا ہے۔ سیاسی اغراض و مقاصد کے تحت ایک ریڈ روز فورم قائم کیا جاتا ہے۔ ان کی کوٹھی سیاسی اور صحافتی سرگرمیوں کے مرکز اور دفتر میں تبدیل ہو جاتی ہے اور عوام اس کو لال کوٹھی کہنا شروع کر دیتے ہیں۔

اسی دوران ابرار حسین کے گھر پر میراثیوں کے ناچنے گانے کا پروگرام ہوتا ہے۔ پروگرام کے بعد شریر مزاج بوبی میاں مراثیوں کے طائفے کو قنبر علی کے حالات اور نظریات سے واقف کرانے کے بعد ان کے ہاں بھیج دیتے ہیں جس میں چار کردار ہوتے ہیں۔ ماسٹر امام بخش موگرے، ان کی بیوی چنبیلی بیگم ناز، بیٹا پری زادہ گلاب بیٹی بیلا شوخ۔ یہ لوگ قنبر علی کے مزاج، جذبات اور ترقی پسند خیالات سے ان کے لگاؤ کو بخوبی سمجھتے ہیں اور ان کی ترقی پسندی کا بڑی ہوشیاری اور عیاری سے استحصال شروع کرتے ہیں۔ دو تین طے شدہ اور منصوبہ بند ملاقاتوں کے بعد بیلا رانی شوخ جو واقعی شوخ ہی نہیں بلکہ پڑھی لکھی عیّار لڑکی ہے، قنبر علی کے گلے پڑ جاتی ہے۔ قنبر علی اپنے چیف رپورٹر معراج احمد کو بیلا شوخ کے حالات سے واقفیت حاصل کرنے کا حکم دیتے ہیں کیوں کہ وہ بیلا کے چکّر میں پھنستے جا رہے ہیں۔ ایک طرف بیلا کی قربت اور ناز نخرے ان کی سوئی ہوئی نفسیاتی کمزوری کو جگا دیتے ہیں

تو دوسری طرف بیلا کے معاشی اور سماجی حالات ان کی ترقی پسندی کی حس کی تسکین کرتے ہیں۔ ان دووجوہ اور بیلا کے ورغلانے پر ایک روز خفیہ اور ڈرامائی شادی کا منصوبہ تیار ہوتا ہے جس میں ان کے دوست رگھبیر پرشاد سنگھ ان کی مدد کرتے ہیں۔ ایک روز طے شدہ خفیہ مقام پر خفیہ پلان کے تحت خفیہ شادی عمل میں آتی ہے۔ بیلا شادی ہی کے وقت مہر میں کوٹھی اپنے نام لکھوالیتی ہے۔ شادی کے بعد قنبر علی اور بیلا ماہ عسل پر رانی کھیت چلے جاتے ہیں۔ واپسی پر کش مکش کے دن شروع ہوتے ہیں۔ بیلا اپنی عیاری سے شوہر قنبر علی پر پوری طرح حاوی ہو جاتی ہے۔ بیلا جو احساسِ کمتری کا شکار ہے، پورے گھر کو تبدیل کرنا اور گھر کے متعلقین پر رعب ڈالنا شروع کرتی ہے۔ منشی بھوانی شنکر سوختہ جن کا قنبر علی باپ کی طرح احترام کرتے ہیں، چپ چاپ بدلتے حالات کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ وہ صرف ایک مرتبہ معاملات میں مداخلت کرتے ہیں جب قنبر علی بیلا کے والد کی مکاری پر تین سو روپیہ مہینہ بھیجنے کی بات کرتے ہیں۔ الحمدو جو گھر کے اندر کی دیکھ ریکھ کرتی ہیں، جن کو اس گھر میں عزت کا مقام ملا ہوا ہے جو جاگیردارانہ سماج واقدار کی پروردہ ہیں ایک روز کسی گھریلو معاملے میں بیلا سے بحث و تکرار کر لیتی ہیں اور نتیجتاً بیلا انھیں گھر سے بے عزت کر کے نکال دیتی ہے۔ دیگر ملازمین بھی جو کافی وفادار ہوتے ہیں، بیلا کے آنے کے بعد بیزار ہونا شروع ہوتے ہیں۔ اسی درمیان قنبر علی الیکشن لڑتے ہیں اور شکست سے دوچار ہوتے ہیں اور بڑا مالی نقصان ہوتا ہے۔ بیلا کی فضول خرچی روز بروز بڑھتی جارہی ہے۔ بیلا کے ان کی زندگی میں قدم رکھنے سے ان کو ذہنی اور قلبی انتشار اور ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ بیلا پورے گھر کو ایک طرف سجاتی اور ترتیب دیتی ہے تو دوسری طرف کوٹھی کے خوشگوار ماحول کو منتشر کرتی ہے۔ اس طرح پوری کوٹھی اور افراد واشخاص نحوست کا شکار ہوتے ہیں۔

بدرالنسا کے انتقال کے کچھ ہی دن بعد ان کی سہیلی علیمہ بانو اپنی لاپرواہی سے ٹیٹنس کا شکار ہو جاتی ہیں اور ایک خوشی کی کرن لے کر انتقال کر جاتی ہیں کیوں کہ ان کو اس بات کا یقین تھا کہ چاندنی بیگم کی شادی قنبر علی سے ہو جائے گی۔ چاندنی بیگم اپنی والدہ کے انتقال کے بعد کالج کے مالک کے گھر پر رہنے لگتی ہے۔ مالک نے چاندنی بیگم پر غلط نظر ڈالنا شروع کر دی۔ نتیجتاً چاندنی بیگم استعفےٰ دے کر قنبر علی کے گھر کی طرف روانہ ہوتی ہے۔ قنبر علی کے گھر

پر پہنچنے کے بعد بیلا سے ملاقات ہوتی ہے جو اس وقت ٹائپ کر رہی تھی۔ بیلا اپنی عیاری کا مظاہرہ یہاں بھی کرتی ہے۔ چاندنی بیگم اس کو قمبز علی کی سکریٹری سمجھ کر مخاطب کرتی ہے اور اپنا تعارف کراتی ہے بیلا اس کو یہ نہیں بتاتی کہ وہ قمبز علی کی بیوی ہے۔ یہ راز چاندنی بیگم پر اس وقت فاش ہوتا ہے جب عید و بیلا کو بیگم صاحب سے خطاب کرتا ہے۔ چاندنی بیگم شرمندہ ہوتی ہے اور فوراً تہیہ کرلیتی ہے کہ اس کو قمبز علی کے آنے سے پہلے ان کا گھر چھوڑ دینا چاہیے۔ اس ارادے کے تحت بیلا سے گزارش کرتی ہے کہ اس کو کہیں ایسی جگہ پہنچادے جہاں اس کو کھانے کو دو روٹی اور رہنے کو کوئی جگہ مل سکے۔ بیلا تھوڑا سا غور و فکر کرنے کے بعد اس کو ناگہانی انوار حسین کی کوٹھی پر لے جاتی ہے جس کو ان کی تین بیٹیوں کی نسبت سے تین کٹوری ہاؤس کہا جاتا ہے۔

بڑی عاجزی کے بعد تین کٹوری ہاؤس میں چاندنی بیگم کو ایک معمولی خادمہ کی حیثیت سے پناہ دی جاتی ہے۔ اس دوران صفیہ کا اسکول بند ہو جاتا ہے۔ پاکستان سے پروین سلطانہ اپنے بچوں کے ساتھ آئی ہوئی ہے۔ اس کو ساڑی اور بلوز سلوانا ہے۔ چاندنی بیگم سلائی میں ڈپلوما کیے ہوئے ہے لیکن اس کو خادماؤں کے ساتھ کھانا سونا اور کام کرنا پڑتا ہے۔ اگر اس گھر میں اس کی کوئی قدر کرتا ہے تو وہ وکی میاں ہیں جو کافی حساس ہیں۔ لیکن کچھ ہی دنوں بعد اس کی خوبصورتی، نیک سیرتی، صبر و تحمل اور سلیقہ مندی سے پورے گھر کے لوگ متاثر ہو جاتے ہیں۔ وقار حسین عرف وکی میاں کی برطانوی بیوی میگی ان کو چھوڑ کر بھاگ گئی ہے تبھی سے وہ کچھ کھوئے کھوئے سے رہتے ہیں۔ گھر کے تقریباً سبھی لوگوں کا خیال تھا کہ شادی ہونے کے بعد وہ بالکل ٹھیک ہو جائیں گے جس کی وجہ سے وکی میاں اور چاندنی بیگم کی ممکنہ شادی کی بات گھر میں چلنے لگی۔ شیریں کاسل کی مسز ڈھونڈی جو شادی کے موضوع پر تین کٹوری ہاؤس کی مشیر ہوتی ہیں۔ ان سے بھی مشورہ لیا جاتا ہے جو اس تجویز کے حق میں فیصلہ کر دیتی ہے۔ اس کوٹھی میں ایک شخص بوبی میاں اس خوش آیند ممکنہ واقعے سے متفق نہیں، وہ کینہ پرور کردار ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ وکی میاں کی شادی نہ ہو تاکہ پوری کی پوری ملکیت ان کے قبضے میں آجائے۔ جس کے لیے وہ ہر ممکن کوشش کرتے ہیں۔ اپنے اس گھٹیا مقصد میں وہ کامیاب تو نہیں ہو پاتے لیکن چاندنی بیگم کی بنتی قسمت کو ضرور بگاڑ دیتے ہیں۔

باغ میں چاندنی بیگم اور وکی میاں کی مختصر گفتگو سے اس بات کا بخوبی احساس ہوتا ہے کہ اگر یہ شادی ہو گئی ہوتی تو ایک کامیاب ازدواجی زندگی کا آغاز ہوتا۔ پروین سلطانہ کے ویزا کی مدت پوری ہونے والی تھی اس طرح چاندنی بیگم کی بھی چھٹی ہونے والی تھی۔ انھی دنوں میں پنکی میاں نے ان کے چشمے کو توڑ دیا، دوسری طرف ماں کے دیئے ہوئے زیورات چوری ہو گئے۔ چاندنی بیگم مجبور ہو کر قنبر علی کو فون کرتی ہے۔ قنبر علی آتے ہیں اور اس کو اپنی کار پر سیر کراتے ہوئے اپنے گھر لے آتے ہیں اور عزت واحترام کے ساتھ رکھتے ہیں۔ لیکن ان کی شریر بیوی بیلا شوخ پورے گھر کو سر پر اٹھا لیتی ہے۔ قنبر علی ایک طرف بیلا سے شادی کر کے متاسف ہیں تو دوسری طرف چاندنی بیگم سے شادی نہ کر پانے پر پچھتاتے ہیں۔ چاندنی بیگم وکی میاں کی محبت اور قنبر علی کی حسرت کے بیچ معلق ہو کر رہ جاتی ہے۔ بیلا چاندنی بیگم جیسی شریف لڑکی کے ساتھ کافی بُرا برتاؤ کرتی ہے۔ چاندنی بیگم نے کبھی کسی کا بُرا نہیں چاہا۔ وہ ہر کسی کے لیے صدقِ دل سے بارگاہِ خدا میں دعا گو رہی۔ اس کا کردار پرکشش ہے تاہم اس کی غربت اور قسمت نے اس کو ہر موڑ پر پریشان کیا۔ اس کی بدقسمتی کی اس وقت تو انتہا ہو گئی جب وہ قنبر علی کی کوٹھی کے ایک کمرے میں بیٹھی غور و فکر میں محو تھی، اچانک بالکل لاشعوری طور پر اس کے ہاتھ سے جلتی ہوئی موم بتی بستر پر گر جاتی ہے اور منٹوں میں پوری کوٹھی مع قنبر علی، بیلا، شنکر سوختہ اور چاندنی بیگم جل کر راکھ ہو جاتے ہیں۔

ناول کے اختتام تک چاندنی بیگم کا سایہ وکی میاں اور صفیہ سلطانہ کے نفسیاتی افق پر منڈلاتا رہتا ہے۔ اس طرح وہ مر کر بھی باقی کرداروں کی زندگی میں زندہ رہتی ہے۔

اس کے بعد قنبر علی اور بیلا کی جائداد کا قضیہ چھیڑ کر ناول کے پلاٹ کو آگے بڑھایا گیا ہے مشرق اور مغرب کے دو مشہور شہروں یعنی بمبئی اور کلکتہ کے دو ممکنہ وارثوں کو لکھنؤ کی عدالت میں یکجا کیا گیا ہے اور اس طرح ناول کے شروعاتی اور آخری حصے کو خوبصورتی سے باندھ دیا ہے۔ اس متنازعہ مسئلے کے حل کے بعد ریڈ روز تین کٹوری ہاؤس شیریں کاسل اور کلکتے کے طاہر علی اور لیلیٰ کی فیملی کو ایک دوسرے سے فنکارانہ طریقے سے باندھا ہے۔

آتش زنی کے سانحے کے بعد بمبئی میں مقیم بیلا کے والدین اور بھائی پریزادہ گلاب

ریڈروز جائداد کے وارث کی حیثیت سے قبضہ کرنے کے لیے لکھنؤ آتے ہیں۔ اسی درمیان قنبر علی کے چچازاد بھائی طاہر علی سروش فیل فروش کو اس سانحے اور جائداد کے مدعی ماسٹر موگرے کے بارے میں اخبار کے ذریعے پتا چلتا ہے۔ وہ فوراً لکھنؤ اپنے متعلقین کو فون کر کے قانونی کارروائی شروع کرنے کا حکم دیتے ہیں۔ ماسٹر موگرے کے کنبے کی قسمت خراب تھی۔ تمام قانونی کاغذات جو عدالت میں ان کی مدد کرتے جل کر راکھ ہو چکے تھے۔ باقی جو گواہ اور کاغذات ان کو مل سکتے تھے وہ بھی دستیاب نہ ہو سکے۔ بہار پھولپوری جو موگرے کے یار و مددگار ہوتے ہیں، امریکہ میں دیوتا کی شکل میں مقیم چکوترا گڑھوالی سے مقدمے کے سلسلے میں ناکام ملاقات کرتے ہیں۔ بہر حال مصنفہ موگرے وغیرہ کو بمبئی لکھنؤ اور بہرائچ کا چکر کٹوا کر نحیف وضعیف کر کے ناول کے پردے سے ہٹا لیتی ہیں۔ طاہر علی مقدمہ جیت جاتے ہیں۔

اس کے بعد کہانی تین کٹوری ہاؤس منتقل ہوتی ہے جہاں رانی صولت زمانی اور راجہ انوار حسین کی وفات پہلے ہی ہو چکی ہے۔ وکی میاں اور بوبی میاں الگ الگ گھروں میں رہتے ہیں۔ وکی میاں کی شادی الائچی خانم کی ایک رشتے دار بہار آرا بیگم سے ہو جاتی ہے اور اپنے اہل و عیال کے ساتھ خوش و خرم زندگی گزارتے ہیں۔ زرینہ سلطان اپنے تین بچوں پنکی میاں، شہلا اور آمنہ کو لے کر وکی میاں کے ساتھ رہتی ہیں۔ پنکی میاں پڑھ لکھ کر بلڈر اور آر کی ٹیکٹ بن چکے ہیں۔ شہلا ایک کامیاب وکیل بن چکی ہیں جو مندر اور مسجد والے مسئلے کو دیکھتی ہیں۔ پروین سلطانہ اپنے دو بچوں فیروزہ اور ڈنکی میاں کے ساتھ پاکستان سے دوبارہ آئی ہوئی ہیں۔ یہیں پر زرینہ سلطان اور پروین سلطان کے درمیان پہلے تو گھریلو اور شخصی حالات پر بحث و مباحثہ ہوتا ہے۔ پھر اس کے بعد پنکی میاں اور فیروزہ کی ممکنہ شادی کو لے کر کشمکش شروع ہو جاتی ہے۔ شیریں کاسل کی مسز ڈھونڈی بھی پنکی میاں اور فیروزہ کی ممکنہ شادی کے لیے ناکام کوشش کرتی ہیں اور ڈنکی سے بحث کرتی ہیں جہاں ہند و پاک کے درمیان بڑھتے نظریاتی و ثقافتی اختلافات کی وضاحت ہوتی ہے۔ اسی موضوع پر ڈنکی میاں اور پنکی میاں سے بھی بحث ہوتی ہے۔ تشخص کا مسئلہ ابھر کر سامنے آتا ہے۔ مصنفہ اس پورے کنبے کو بہرائچ اور ترائی کی سیر کراتی ہیں۔ اس سیر و سیاحت میں پنکی میاں اور فیروزہ کو ایک ساتھ رکھ کر مختلف موضوعات پر خوشگوار ماحول میں گفتگو کرواتی ہیں۔

اس سیر وسیاحت اور کش مکش کے بعد کہانی شیریں کا سل منتقل ہوتی ہے جہاں مسز ڈھونڈی اپنے دو بچوں فرہاد ڈھونڈی عرف قلی اور مہناز کے ساتھ قیام پذیر ہیں۔ اسی شیریں کا سل میں پنکی میاں اور فرہاد عرف قلی روز ہاؤس کا نقشہ بنانے میں لگے ہوئے ہیں کیوں کہ دونوں مشہور و مقبول عمارت ساز اور ماہر تعمیر ہو چکے ہیں۔ لیلیٰ فروش جو طاہر علی فیل فروش کی بیٹی ہے اور ایم بی اے کرنے کے بعد والد کا کاروبار میں ہاتھ بٹاتی ہے، شیخ قنبر علی کی متنازعہ جائداد کا مقدمہ جیتنے کے بعد قبضہ کرنے اور ایک "ہائی رائیز" عمارت بنوانے کے سلسلے میں لکھنؤ آتی ہے۔ اس کی ملاقات پنکی میاں سے ہوتی ہے۔ اسی دوران مندر مسجد تنازعہ شروع ہو جاتا ہے جس سے لیلیٰ فروش کو بڑی الجھن ہوتی ہے۔ اسی درمیان معراج احمد امریکہ سے ہندستان آتے ہیں۔ وہ مسجد مندر اور جھانگڑ والی کوٹھی کے حالات کا بطور صحافی مشاہدہ کرتے ہیں اور اس موضوع پر پنکی میاں سے گفتگو کرتے وقت موجودہ صورتحال کا تاریخی اور سماجی تجزیہ کرتے ہیں۔ گفتگو کے درمیان بابری مسجد اور رام جنم بھومی قضیے کا براہ راست حوالہ دیتے ہیں جس سے پوری موجودہ سیاسی صورت حال کی عکاسی ہو جاتی ہے۔

جغرافیائی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو ناول کا پلاٹ تین اہم شہروں پر مشتمل ہے۔ لکھنؤ کو گرچہ مرکزی حیثیت حاصل ہے تاہم بمبئی اور کلکتہ کو پلاٹ کے مرکزی حصے یعنی لکھنؤ کے دائیں اور بائیں ہاتھ کی حیثیت حاصل ہے۔ بہر حال قنبر علی اور طاہر علی کی پوری جائداد مذہبی رنگ اختیار کرنے کے بعد دوبارہ عدالت میں ایک پیچیدہ مسئلے کی شکل میں پہنچتی ہے۔ شہلا جو اب ایک کامیاب وکیل بن چکی ہے، مقدمے کو دیکھتی ہے۔ ارشد حسین جو لیلیٰ فروش کے ماموں ہیں مقدمے کے تعلق سے شہلا سے ملتے رہتے ہیں یہ ملنا جلنا بعد میں عشقیہ تعلق میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ مقدمے کی وجہ سے بلڈنگ کا کام ملتوی ہو جاتا ہے۔ اسی اثناء پنکی میاں اور لیلیٰ فروش ایک دوسرے کو پسند کرنے لگتے ہیں اور شادی بھی طے ہو جاتی ہے۔ لیلیٰ فروش صفیہ سلطانہ کے حالات جاننے کے بعد کوشش کرتی ہے کہ صفیہ سلطانہ کی شادی اس کے ماموں ارشد حسین سے ہو جائے جن کا کانپور میں چمڑے کا بہت بڑا کاروبار ہے۔ اس کوشش کی خبر صفیہ سلطانہ کو مل چکی تھی اس کے بعد قسمت کی ستم ظریفی دیکھیے کہ صفیہ کی ملاقات ارشد حسین سے شہلا کرواتی ہے جہاں صفیہ سلطانہ بڑی کش مکش میں پڑتی ہے۔

بہر حال ناسازگار حالات کی وجہ سے لیلیٰ فروش اپنے نیک ارادے میں کامیاب نہیں ہو پاتی۔ شہلا اور ارشد حسین کی شادی طے ہو جاتی ہے جس کی خبر صفیہ کو ملتی ہے تو اس کو نفسیاتی اور جذباتی دھچکا لگتا ہے جو جان لیوا ثابت ہوتا ہے۔

اس طرح چاندنی بیگم کا پلاٹ ایک پیچیدہ برگد کے درخت کے مانند ہے جس کے تنے سے مختلف شاخیں اچھی طرح جڑی ہوئی ہیں۔ ناول کا پورا پلاٹ تین ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ہر دور کی ایک نسل ہوتی ہے۔ اس کا اپنا ایک سماج اور نظام ہوتا ہے۔ اس کے اپنے مخصوص اقدار ہوتے ہیں۔ اس ناول کا پہلا دور نو آبادیاتی اور جاگیر دارانہ سماج و نظام اور اقدار کی عکاسی کرتا ہے۔ اس دور کے اہم کردار بیر سٹر اظہر علی، بدرالنسا، انوار حسین، رانی صولت زمانی اور بھوانی شنکر سوختہ وغیرہ ہیں۔ دوسرا دور عبوری دور ہے جس میں پرانے اقدار مائل بہ زوال ہیں۔ اس دور کے بھی کچھ اہم کردار ہیں جیسے قنبر علی، بوبی میاں، وکی میاں وغیرہ۔ تیسرا دور اس وقت شروع ہوتا ہے جب سرمایہ دارانہ سماج و نظام اور اقدار پوری طرح ابھر کر منظر عام پر آتے ہیں۔ اس دور کے بھی کچھ اہم کردار ہیں۔ جیسے پنکی میاں، فیروزہ ڈنگی میاں اور شہلا وغیرہ جو اپنے ماضی سے کافی حد تک کٹ چکے ہیں جو بین الاقوامی اقدار و اثرات کے پروردہ ہیں، جن کا اپنا کوئی مستحکم تشخص نہیں۔

ناول کا پورا پلاٹ تین واضح اثرات پر مبنی ہے: آزادی اور تقسیم ہند کا اثر قیامِ پاکستان اور ہندوپاک کے ناسازگار حالات کا اثر اور بڑھتی ہوئی بین الاقوامیت کا اثر۔ شروع کے دو ادوار میں کچھ چھوٹے چھوٹے کردار ہیں جو دھیرے دھیرے ختم ہوتے چلے جاتے ہیں۔ کیوں کہ پلاٹ ایک دور سے دوسرے دور اور دوسرے دور سے تیسرے دور میں قدم رکھتا چلا جاتا ہے۔ ان میں سے کچھ اہم رول ادا کرتے ہیں۔ جن کے رویے میں اپنے سماج اور نظام اور اقدار کی پوری عکاسی ہوتی ہے، جن کا ایک مستحکم نظامِ اخلاق اور تہذیبی مزاج ہے جس سے طبقاتی درجہ بندی کے آداب کی وضاحت ہوتی ہے اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور خوشگوار ماحول دیکھنے کو ملتا ہے۔

قنبر علی اظہر علی اور بدرالنسا کے اکلوتے بیٹے ہیں۔ نازوں میں پلے ہونے کی وجہ سے چہرے پر ہلکی سی زردی بھی ہوتی ہے اور اپنے والد اظہر علی کے برخلاف نئی روش کے

نوجوان ہوتے ہیں۔ اسٹوڈنٹس یونین میں ذاتی املاک کے خلاف دھواں دھار تقریریں کیا کرتے ہیں۔ بحث و مباحثے میں والد کے برعکس کمزور ہوتے ہیں قنبر علی کی زبان میں ہلکی سی لکنت ہے جو ممکن ہے والد کے رعب و دبدبہ کا نتیجہ ہو۔ جب ان کو اس خامی کا احساس ہوا تو اسے دور کرنے کی خوب مشق کی، اسٹوڈنٹس یونین کا الیکشن لڑنا شروع کیا اور نتیجتاً یونین کے لیڈر بھی بن گئے۔ قنبر علی ایک سوشل آدمی ہیں اور ان کے کردار میں مثالیت پسندی کا عنصر ملتا ہے۔ مارکسی نقطہ نظر سے ہر چیز کو دیکھتے ہیں اور ان کے کردار میں مثالیت پسندی کا عنصر ملتا ہے۔ مارکسی اصطلاحات استعمال کرتے ہیں جیسے پیداواری رشتے، رجعت پسندی، محنت کش عوام کا استحصال اور زوال پرست وغیرہ۔ قنبر علی کے مارکسی نظریات میں روز بروز شدت آتی جاتی ہے وہ امیر زاویوں سے شادی کے روادار نہیں۔ اپنے قول و فعل میں ہم آہنگی پیدا کرنے اور عملی مارکسسٹ بننے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔

قنبر علی کی پرورش لاڈ اور پیار میں ہوئی ہے۔ والدین ان کی ہر خواہش پوری کرتے ہیں۔ قنبر علی عیاش لوگوں کے ساتھ رہتے ہیں جس کی وجہ سے ان پر بُرے اثرات مرتب ہو جاتے ہیں اور یہ دوستوں کے ساتھ شراب اور سگریٹ پینے لگتے ہیں۔ رفتہ رفتہ یہ گھر میں کھلے عام شراب پینے لگتے ہیں۔ اس طرح ان کی شخصیت میں تضاد پایا جاتا ہے کیوں کہ ان کے جیسے مارکسسٹ کو یہ باتیں زیب نہیں دیتیں کہ وہ صارفیت اور عیش و عشرت کی زندگی گزاریں۔

قنبر علی پندرہ روزہ انگلش، اردو اور ہندی رسالوں "ریڈ روز"، "گل سرخ" اور "لال گلاب" کو ہفتہ وار کر دیتے ہیں اور اپنی سیاسی، ادبی اور سماجی مشغولیات میں پہلے سے زیادہ منہمک ہو جاتے ہیں۔ ان کے گھر پہ صحافی، سیاست کار اور اردو ہندی کے ترقی پسند ادیب و شاعر جمع ہوا کرتے ہیں اور مختلف موضوعات پر بحث و مباحثہ کرتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قنبر علی کی سماجی پوزیشن کافی مستحکم ہے۔

قنبر علی بچپن سے ہی کافی باذوق ہیں۔ وہ اپنی والدہ کے ساتھ ریڈیو پر مختلف تھیٹریکل پروگرام سنا کرتے اور بعض اوقات سینما بھی ان کے ساتھ دیکھنے جاتے۔ اس سے لگتا ہے کہ ان کے والدین کچھ معاملات میں کافی ترقی پسند ہیں اور مختلف ذوق و شوق رکھتے ہیں۔ قنبر علی

نہایت حساس واقع ہوئے ہیں۔ وہ لوگوں کے دکھوں اور پریشانیوں سے بہت جلد متاثر ہو جاتے ہیں۔

قنبر علی آدمی کی ظاہری اور باطنی شخصیات کا بغور مشاہدہ مارکسی نظریات سے کرتے ہیں۔ ماسٹر موگرے اور ان کی اہلیہ وغیرہ خستہ حال لوگ ہیں۔ اس کے مستحق ہیں کہ قنبر علی جیسا ترقی پسند اور متمول شخص ان پر ہمدردانہ نظر ڈالے۔ چاہتے ہوئے بھی انھیں نظرانداز نہیں کر پاتے۔ قنبر علی حاضر جواب بھی ہیں اور ان کی حاضر جوابی میں بذلہ سنجی ملتی ہے۔ جو ان کے خوش مزاج ہونے کی دلیل ہے۔

قنبر علی کی شخصیت میں ایک قسم کی تہذیبی اور نظریاتی کش مکش دیکھنے کو ملتی ہے۔ در اصل ان کی ساخت و پرداخت جاگیردارانہ سماج میں ہوئی ہے۔ لیکن ان کی تعلیم و تربیت اس تعلیمی، سیاسی اور سماجی فضا میں ہوتی ہے جس میں جدید خیالات اور ترقی پسند رجحانات زور پکڑتے جا رہے ہیں۔ یعنی وہ عبوری دور کے پروردہ ہیں جس کی وجہ سے متضاد کیفیات و حالات سے دوچار ہو کر ایک قسم کی تہذیبی و نظریاتی کش مکش میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ ان کے ہاں پرانے اقدار اور سماجی بندھنوں سے انحراف ضرور دیکھنے کو ملتا ہے لیکن بغاوت نہیں۔ ان کی ترقی پسندی میں فریفتگی اور ہلکاپن محسوس ہوتا ہے۔

قنبر علی بچپن ہی سے تھوڑے سے ضدی واقع ہوئے ہیں۔ شاید والدین کے لاڈ پیار نے ان میں یہ خاصیت پیدا کر دی ہے۔ قنبر علی اپنے ذوق و شوق کے مطابق سیر و تفریح بھی کرتے ہیں۔ جب وہ کسی سے متاثر ہوتے ہیں تو اس کی خاطر تواضع بھی خوب کرتے ہیں اور اس کے تئیں نرم گوشہ بھی رکھتے ہیں۔ قنبر علی ذات پات کی سطح پر کسی کو نہیں تولتے۔ وہ صرف اور صرف اس کی ذہنی اور قلبی کیفیات اور موجودہ اور سابقہ حالات سے واقفیت رکھنا چاہتے ہیں۔ اس کے ماضی اور حال کے حرکات و سکنات جاننا چاہتے ہیں۔ اس لیے وہ اپنے چیف رپورٹر معراج احمد کو ماسٹر موگرے اور ان کے اہل و عیال کے بارے میں جاننے کے لیے تعینات کرتے ہیں۔

قنبر علی کو اپنی اور اپنے والدین کی حیثیت کا بخوبی احساس ہے۔ وہ شرمندگی کے ساتھ محسوس کرتے ہیں کہ بیلا جیسی ذومنی سے ان کا تعلق ان کی سماجی حیثیت کو منفی طور پر متاثر

کرے گا۔ کیوں کہ پورا معاشرہ اس قسم کی ترقی پسندی کے لیے ابھی تیار نہیں ہوا ہے۔

قنبر علی تاریخ کے اوراق میں مضمر پس ماندہ طبقے کے استحصال کی داستان کو مارکسی نظریات کی عینک سے دیکھتے ہیں۔ اپنے آباء واجداد کے استحصالی رویّوں کو قبول کر کے معذرت خواہ ہوتے ہیں۔ قنبر علی کے کردار میں خوداعتمادی کی کمی ہے۔ اس کا احساس اس وقت بخوبی ہوتا ہے جب وہ پریشان کن حالات میں ہڑبڑاہٹ کی کیفیت سے دوچار ہوتے ہیں۔ اس وقت ان کی زبان میں لکنت آجاتی ہے۔ لہجے میں ڈھیلا پن اور چہرے پر پسینہ آجاتا ہے۔ اس طرح ان کے کردار میں فینس Finesse کی کمی کھٹکتی ہے۔

قنبر میاں کے مزاج میں جو بوقلمونی دیکھنے کو ملتی ہے، وہ اس لیے کہ ان کی ساخت و پرداخت اس جاگیردارانہ سماج میں ہوئی ہے جہاں ڈرامہ، قوالی، نوٹنکی اور مشاعرے وغیرہ ہی تفریح کے ذرائع ہیں جو تہذیب کے مظاہر میں شمار کیے جاتے ہیں۔ دراصل وہ عبوری معاشرے کے پروردہ ہیں، اس لیے ان کے کردار میں مختلف النوع قسم کی قدیم و جدید معاشرے کی خصوصیات دیکھنے کو ملتی ہیں۔

قنبر پر کبھی کبھی بزدلی کا گمان بھی گزرتا ہے۔ بیلا کی ناشائستہ حرکتوں اور شاطرانہ چالوں کو روک کر وہ اپنے کو اس سے دور کر سکتے تھے لیکن وہ تو بیلا کی زلفِ گرہ گیر کے بیوقوفی کی حد تک گرویدہ ہو جاتے ہیں۔ والدین کی وفات کے بعد دھیرے دھیرے وہ اپنے دائمی زوال کی طرف لاشعوری طور سے بڑھ رہے ہیں۔ قنبر علی اپنی نظریاتی جذباتیت اور بیوقوفانہ عشقیہ فریفتگی کے جال میں ایک طرف سے پھنستے ہیں تو بیلا اور اس کے والدین کی شاطرانہ چالوں کے جال میں دوسری طرف سے اور تیسری طرف پریزادہ گلاب کے ڈر نے ان کو پریشان کر رکھا ہے۔ چوتھی طرف اپنی اور والدین کی سماجی حیثیت کا انھیں شدید احساس ہے اور وہ بھی ان کے لیے پریشانی کا باعث ہے۔

قنبر علی ایک ذمّے دار شوہر کی حسیت اور خصوصیات سے محروم لگتے ہیں۔ وہ اپنی بیوی کے جذبات اور خواہشات کو سمجھنے اور ان پر توجہ دینے سے قاصر ہیں۔ ان کے بیشتر اوقات دوستوں میں گزرتے ہیں جو بیلا کے لیے باعثِ کوفت ہے۔ بیلا اس کو اپنی توہین سمجھتی ہے۔

قنبر علی ناتجربہ کار اور معصوم کردار ہے۔ اسی لیے ماسٹر موگرے ان کا استحصال کرتے

ہیں۔ الیکشن میں کھڑے ہونا ان کے لیے کوئی نئی بات نہیں۔ وہ اسٹوڈنٹس یونین کے لیڈر رہ چکے ہیں۔ نیشنل الیکشن اور سیاست میں قدم رکھنے کی ناکام کوشش کرتے ہیں جس میں بڑا مالی نقصان ہوتا ہے۔ اس مالی نقصان اور سیاسی شکست کی وجہ سے مایوسی کے بری طرح شکار ہو جاتے ہیں نتیجتاً شراب کی طرف کچھ زیادہ ہی متوجہ ہو جاتے ہیں۔ بیلا اور قنبر علی کے درمیان تہذیبی کش مکش زبان و بیان اور مزاج کی سطح پر بخوبی دیکھی جا سکتی ہے۔

قنبر علی کی ترقی پسندی اور مارکسیت برائے نام ہے وہ جس عیش و آرام اور شراب و کباب میں زندگی کے دن ترقی پسندی کے نام پر گزارتے ہیں اس سے اس بات کی نشاندہی ہوتی ہے کہ ان کی بیلا سے شادی ان کی ترقی پسندی نہیں جنسی اور نفسیاتی خواہش کا نتیجہ ہے۔ قنبر علی کی ازدواجی زندگی زیادہ کامیاب نہیں ہونے پاتی۔ ان کی صحت پر اس کا اثر پڑنے لگتا ہے۔

قنبر علی کو بیلا کے علاوہ دیگر لوگوں سے نبٹنا بخوبی آتا ہے۔ لیکن بیلا کے سامنے وہ بے زبان نظر آتے ہیں۔ قنبر اپنی ازدواجی زندگی اور بیلا سے ناخوش اور غیر مطمئن ہیں۔ وہ اپنے متعلق بیلا کی تمام گستاخیاں نظر انداز کر دیتے ہیں مگر والدین کی روحوں کے ساتھ بیلا کی بدتمیزی کو برداشت نہیں کر پاتے اور اسے مار بیٹھتے ہیں۔

بدرالنسا اظہر علی کی بیگم اور قنبر علی کی والدہ ہیں۔ ان کو لوگ بٹو باجی کہا کرتے ہیں۔ وہ ایک سوشل عورت ہیں، سماج سدھارک ہیں۔ زنانہ جلسوں میں حقوق نسواں پر تقریریں کرتی ہیں۔ ممتاز خواتین کے وفد میں شامل ہو کر مختلف ممالک کا دورہ بھی کرتی ہیں بدرالنسا نہایت نرم دل ہیں اور پریشان حال عورتوں کی مدد کرتی ہیں۔ بدرالنسا ایک آئیڈیلسٹ کردار ہیں۔ ان کی گفتگو کا انداز خطیبانہ ہے۔ قوم کی زبوں حالی سے پریشان دکھائی دیتی ہیں اور قوم کی فلاح و بہبود کے لیے غور و خوض کرتی ہیں۔ قوم کے دیگر دولت مند لوگ مختلف مواقع پر غیر ضروری خرچ کرتے ہیں تو وہ متفکر ہو جاتی ہیں اور چاہتی ہیں کہ ان وسائل کو قوم، خصوصاً عورتوں کی معاشی بہتری کے لیے استعمال کیا جائے۔ قوم میں پھیلی ہوئی کاہلی سے وہ اداس دکھائی دیتی ہیں۔ بدرالنسا کہیں کہیں رجعت پسند نظر آتی ہیں منشی بھوانی شنکر سوختہ ان سے کہتے ہیں کہ قنبر علی شربری دیبی کے ساتھ پریس گئے ہیں تو وہ تجسس میں پڑ جاتی ہیں

کیوں کہ معاشرے میں انٹر کیمونٹی شادیوں کی لہر چل رہی تھی اور اس کے نتیجے میں بچوں کے نام بالکل مبہم سے رکھے جانے لگے تھے۔

مذہبی تیوہار ان کے ہاں تہذیبی تقریبات کی شکل اختیار کرتے جارہے تھے۔

مسلم لڑکیوں کو رشتے نہیں مل رہے تھے۔ان باتوں سے وہ متفکر دکھائی دیتی ہیں۔

علیمہ بانو، چاندنی بیگم کی ماں جو بنو بیگم کی بچپن کی سہیلی ہیں، بنو بیگم جب اپنے میکے جاتی ہیں تو علیمہ بانو سے ملاقات کرتی ہیں اور قنبر علی کی شادی چاندنی بیگم سے کرنے کی تجویز پیش کرتی ہیں اس پر علیمہ کو تعجب ہوتا ہے کیوں کہ بنو بیگم کی سماجی حیثیت ان سے بہت زیادہ ہے اور ان کو یقین نہیں ہوتا کہ وہ ایک غریب گھرانے میں اپنے بیٹے کا رشتہ کریں گی۔ چاندنی بیگم نہ صرف بدرالنسا کو پسند ہے بلکہ قنبر علی کی جو شرائط تھیں وہ سب پوری کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔

بدرالنسا قدیم اقدار کی پروردہ ہیں۔اپنے شوہر کے انتقال کے بعد وہی وضع قطع اختیار کرتی ہیں جو عام طور پر ہندستانی بیوہ عورتیں اختیار کرلیتی ہیں۔ شوہر کی موت کا اثر ان پر بھی ویسا ہی ہوا جیسا کہ عام ہندستانی عورتوں پر ہوتا ہے۔ان کے مزاج اور لباس میں بڑی تبدیلی آجاتی ہے۔ سفید کھادی سلک کی ساری یا سفید غرارے کے جوڑے میں ملبوس رہتی ہیں اور بجھی بجھی سی رہنے لگتی ہیں۔ تاہم عدت پوری کرکے حقوق نسواں کے لیے جدو جہد جاری رکھتی ہیں۔ قومی ہمدردی، ہمدردیِ نسواں اور انسانی ہمدردی ان کی شخصیت کی اہم خصوصیات ہیں۔ تمام لوگوں سے اچھے اور خوشگوار تعلقات رکھتی ہیں۔ان کی فلاح و بہبود کے لیے عمل پیرا رہتی ہیں۔

شیخ اظہر علی ایک کامیاب وکیل ہیں۔وہ زمین اور جائداد جیسے پیچیدہ مقدمے جیتنے کے لیے بہت مشہور ہیں۔سوشل آدمی ہیں۔ سماج میں ان کو ایک اہم مقام حاصل ہے وہ بہت نرم دل ہیں اپنے کھیتوں سے بے دخل کسان ان کے ہاں آتے ہیں تو یہ بلا معاوضہ ان کی قانونی مدد کرتے ہیں۔

بیلا شوخ ماسٹر موگرے کی بیٹی ہے۔اس کے اطوارِ زندگی اس کے والدین جیسے ہیں یہ بھی خوشامد پسند اور چاپلوس ہے۔ناز نخرے اور تنک مزاجی سے پُر ہے ساتھ ہی ساتھ ایک

قسم کی بیزاری ار شرمندگی کی لے اس کے کردار میں موجود ہے۔ اپنے معاشی اور سماجی حالات کی وجہ سے وہ احساسِ کمتری کا شکار دکھائی دیتی ہے۔ بیلا شوخ مغنیہ اور ہلکی پھلکی شاعرہ بھی ہے۔ پنج گنی میں پڑھی ہوئی ہے۔ انگریزی اچھی اور روانی سے بولتی ہے۔ ایک ہوشیار اور چالاک لڑکی ہے۔ بیلا اور اس کے والدین قنبر علی کی ترقی پسندی اور مارکسیت کی تعریف کر کے ان کو عملی ترقی پسند اور مارکسسٹ ہونے کا ثبوت دینے پر مجبور کر دیتے ہیں۔

بیلا شوخ حقیقتاً ایک اداکارہ ہے۔ اس نے ایک مصیبت زدہ لڑکی کا چوغہ کچھ اس طرح اوڑھ رکھا ہے کہ نہایت حساس، اور احمقانہ جذباتیت سے پُر قنبر علی متاثر ہو جاتے ہیں۔ بیلا نہایت حساس واقع ہوئی ہے۔ وہ اپنے اور اپنے والدین کے ماضی اور حال کے ناسازگار حالات سے ملول ہو جاتی ہے۔ کبھی ناکام ہوتی ہے تو رونا شروع کر دیتی ہے۔ بیلا شوخ اور اس کے والدین کو حالات نے کافی ہوشیار بنادیا ہے۔ وہ جب قنبر علی کی نظریاتی جذباتیت اور نفسیات سے بخوبی واقف ہو جاتے ہیں تو ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت قنبر علی کا استحصال کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ بیلا اس منصوبے کے نفاذ میں بہتر اداکاری کا نمونہ پیش کرتی ہے۔

بیلا قنبر علی کی دولت اور نظریاتی جذبانیت کی وجہ سے ان کے قریب آتی ہے۔ اس کی شادی کرنے کی وجہ بھی صرف اور صرف مادی ہے۔ اپنے معاشی حالات کو بہتر کرنے کے لیے وہ قنبر علی کی جائداد پر قابض ہونا چاہتی ہے تاکہ قنبر علی اگر طلاق بھی دیں تو مہر میں اس کو قنبر علی کی کوٹھی مل جائے۔ دراصل اس کی نانی جعفر باندی او. ماں اللہ جلائی عرف چنبیلی کو ماضی میں ایک مرتبہ بڑی بے رحمی سے محل بدر ہونا پڑا تھا۔ اس لیے اس کے والدین اور وہ کافی ہوشیاری سے کام لیتے ہیں۔ وہ بہت بے باک ہے اور اس کی بے باکی میں بدتمیزی بھی شامل ہے۔ اس کی بے باکی، بدتمیزی اور شاطرانہ ذہنیت کی وضاحت مندرجہ ذیل اقتباس سے بخوبی ہوتی ہے:۔

"جی۔ قوم سے زیادہ آپ کے بیوی بچوں کا اس پر حق ہے۔ آپ کی یہ اول فول بہت سن چکی ہوں۔ انقلاب اور فلانہ ڈھماکہ۔ آل بلڈی نون سنس۔ آپ پرائیویٹ پراپرٹی میں تو یقین ہی نہیں رکھتے نا، اور میں اپنی نانی جعفر باندی اور ماں اللہ جلائی عرف چنبیلی کی طرح ایک منٹ کے نوٹس پر محل بدر

ہونے کو تیار نہیں۔"

بیلا قنبر علی کی کوٹھی میں جب بحیثیت مالکن قدم رکھتی ہے تو اس کو اپنے ماضی اور موجودہ حیثیت کا بخوبی احساس ہے۔ اس کی ماضی کی سماجی اور معاشی حیثیت قنبر علی کے خدمتگاروں سے بہتر نہ تھی جس کا اس کو بخوبی احساس ہے۔ اس احساس نے اس کو احساسِ کمتری کی دلدل میں ڈال رکھا ہے جس میں وہ کبھی کبھی اپنے آپ کو دھنستا ہوا محسوس کرتی ہے۔ اس کیفیت سے جب کبھی وہ اپنی موجودہ حیثیت کی مدد سے نکلنے کی کوشش کرتی ہے تو اپنے کردار کی بھدی اور غیر مہذب شکل لے کر نکلتی ہے۔ اس طرح وہ متفکر ہوتی ہے کہ اپنے خدمتگاروں سے کس طرح پیش آئے۔

بیلا گھر وغیرہ کو سجانے کا شوق رکھتی ہے۔ طرح طرح کے کھانوں طرح طرح کے کپڑوں اور ان سے متعلق فیشن میگزین پڑھ کر اسی سمت میں قدم اٹھاتی ہے جس کی وجہ سے گھر کی مالی حالت روز بروز ابتر ہوتی جارہی ہے اور نتیجتاً قنبر میاں کو ہلکی سی تشویش رہتی ہے۔ لیکن بیلا پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا بلکہ بڑھتے اخراجات پر قنبر علی کی تشویش پر ان سے بحث کرتی ہے۔

بیلا اور قنبر علی کے درمیان جب بھی کسی موضوع پر بحث و مباحثہ ہوتا ہے تو بیلا کے دلائل قنبر علی کو لاجواب کر دیتے ہیں کیوں کہ قنبر علی خود کئی بڑی خامیوں میں پھنسے ہوئے ہیں۔ بیلا قنبر علی کو شوہر کی طرح دیکھتی ہے دیوتا کی طرح نہیں۔ وہ برابری کا درجہ چاہتی ہے اور ایسا ہی برتاؤ بھی کرتی ہے جبکہ قنبر علی بیلا کو آزادی تو دیتے ہیں لیکن اپنی برتری کو مدنظر رکھ کر برتاؤ کرتے ہیں۔ بیلا تمام موضوعات پر مادی نقطہ نظر سے سوچتی ہے یہ کوئی تعجب خیز بات نہیں۔ اس لیے کہ بیلا کا جو ماضی ہے وہ ہر طرح سے ابتر رہ چکا ہے۔ اسی سے جڑا ہوا ایک پہلو یہ ہے کہ بیلا انفرادی نقطہ نظر سے سوچتی ہے۔ اس لیے کہ پچیس سال کی بدتر زندگی گزارنے کے بعد اسے عیش و آرام کی زندگی گزارنے کا موقع ملتا ہے۔ بعض اوقات قنبر علی سے بدتمیزی اور مار پیٹ پر اتر آتی ہے جس سے اس کے تہذیبی پس منظر کی عکاسی ہوتی ہے۔ لیکن قنبر علی جو کہ اپنے معاشرے میں ایک اہم حیثیت کے مالک ہیں، بیلا کی بدتمیزی سکون کے ساتھ برداشت کرتے ہیں۔

بیلا قنبر علی کی مزاجی کیفیات کا استحصال کرتی ہے اور طرح طرح سے ان کو تنگ کرتی ہے۔ یہاں تک کہ کنویں میں گر کر باغ بھی اپنے نام لکھوالیتی ہے۔ بیلا کو ماضی کی طبقاتی کش مکش کا احساس اپنی مالی حالت بہتر ہونے کے بعد بھی ستاتا ہے۔ اس لیے وہ تین کنوری والوں کو تحقیر کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ معاشی اور ساجی حالات بدلنے کے بعد بھی ثقافتی سطح پر اپنے طبقے کی عکاسی کرتی ہے۔

بیلا مہمان نوازی کے آداب سے کوری اور تلخ مزاج کردار ہے۔ ساتھ ہی غیر مہذب بھی ہے۔ تین کنوری ہاؤس میں بوبی اپنی مادیت کے سبب چاندنی بیگم کو دور رکھنا چاہتے تھے اور بیلا اپنی ناشائستگی، نفسیاتی اور جنسی رقابت کی وجہ سے چاندنی بیگم کو تنفر اور مشکوک نگاہوں سے دیکھتی ہے۔ بیلا اور قنبر علی کے درمیان ساخت و پرداخت، تعلیم و تربیت، ساجی اور تہذیبی پس منظر کا کافی فرق ہے۔ جس کی وجہ سے دونوں میں ہر چھوٹے بڑے موضوع پر ان بن ہوتی رہتی ہے۔

چاندنی بیگم ایک معصوم، بھولی بھالی، پردہ دار اور شریف کردار ہے جس میں مکاری و عیاری نام کو بھی نہیں ہے۔ اس کے آباواجداد متمول لوگ تھے۔ اس کے والد پاکستان چلے گئے اور وہیں سے طلاق لکھ کر اس کی ماں علیمہ بانو کو بھیج دی۔ چاندنی بیگم اور اس کی والدہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں اور کالج میں پڑھا کر زندگی گزارتی ہیں۔ کالج میں ان کا استحصال ہوتا ہے۔ کچھ دنوں بعد علیمہ بانو کا انتقال ہو جاتا ہے تو چاندنی بیگم اپنی عزت و عصمت بچا کر قنبر علی کی کوٹھی پر وارد ہوتی ہے۔ اس کی زندگی اور مصائب لازم و ملزوم ہو چکے ہیں چاندنی بیگم کی تعلیم، گھریلو پس منظر، دیگر احوال اور مزاج پر غور کرنے کے بعد اس کا شدید احساس ہوتا ہے کہ کاش چاندنی بیگم اور قنبر علی کی شادی ہو گئی ہوتی تو قنبر کا کنبہ اور بچی کھچی مشترکہ تہذیب، فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور ابھرتے ہوئے مثبت جدید خیالات کا متوازن اور خوشگوار تسلسل جاری رہتا۔

چاندنی بیگم اچھی سمجھ بوجھ اور صبر و تحمل میں آپ اپنی مثال ہے۔ وہ نرم دل ہے۔ مصائب سے دوچار ہو کر خاموشی سے آنسو بہانا شروع کر دیتی ہے۔ تمام مصائب اور پریشانیوں کے باوجود ہر حالت میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتی ہے۔ چاندنی بیگم اپنی تمام

پریشانیوں اور دکھوں کے باوجود جب کبھی تفریح کا موقع آتا ہے، اپنے مصائب بھول کر خوش ہو لیتی ہے۔اس طرح وہ خوش مزاج نظر آتی ہے۔ چاندنی اپنے والدین کو مصائب میں شدت کے ساتھ یاد کرتی ہے، خصوصاً اپنے والد کو بڑے معصومانہ انداز سے یاد کرتی ہے اور متعجب ہوتی ہے کہ باپ کیسے پتھر دل ہوتے ہیں۔ شروع میں شادی سے گھبراتی ہے۔اس کی والدہ اس کی شادی کے لیے متفکر ہوتی ہیں۔ تین کٹوری ہاؤس میں چاندنی بیگم اور وحی میاں کی ممکنہ شادی کے موضوع پر کافی بحث ہوتی ہے اور بوبی میاں کی وجہ سے یہ شادی نہیں ہو پاتی۔

چاندنی بیگم ذہنی پریشانی میں جلد مبتلا ہو جاتی ہے۔اس کے کردار میں ہمت اور مقاومت کی کمی ہر وقت کھٹکتی ہے جو وہ خود بھی محسوس کرتی ہے۔ اس لیے امتحان کی گھڑی میں جب کبھی وہ ہمت کر کے کچھ کہتی ہے تو بعض اوقات جملے غیر موزوں ہو جاتے ہیں صبر و تحمل اور مذہبی عقیدے کے سہارے کٹھن سے کٹھن حالات کو جھیلنا اس کے کردار کی اہم خاصیت ہے۔ چاندنی بیگم کے برتاؤ ردِ عمل اور گفتار سے اس بات کی بخوبی وضاحت نہیں ہو پاتی ہے کہ وہ شادی کی مخالف ہے یا حامی۔

وحی میاں کی شخصیت کے بارے میں سنی سنائی باتوں اور جو کچھ چاندنی بیگم خود ان سے بات کر کے اور دیکھ کر محسوس کرتی ہے، دونوں میں کافی تضاد دیکھنے کو ملتا ہے۔ نتیجتاً وہ ان کی شخصیت کے بارے میں کنفیوز اور مشکوک ہو جاتی ہے تاہم بحیثیت مجموعی ان سے متاثر ہے اور ان کے لیے ایک نرم گوشہ رکھتی ہے۔ چاندنی بیگم حالات اور ماحول سازگار ہونے پر خوش مزاجی کا مظاہرہ کرتی ہے۔ وحی میاں کی شادی کی پیش کش کو قبول کر لیتی ہے مگر وحی میاں کے گھریلو حالات نے اس کو شادی سے انکار پر مجبور کر دیا۔ تاہم وحی میاں کے لیے نیک خواہشات رکھتی ہے۔

چاندنی بیگم کو بچپن کے علاوہ دوشیزگی کی لطیف وقتی خوشیاں دو موقعوں پر ملتی ہیں۔ ایک مرتبہ تو اس وقت جب اس کی ملاقات وحی میاں سے باغ میں ہوتی ہے دوسری مرتبہ اس وقت جب قنبر علی اس کو اپنی کوٹھی پر لے جاتے وقت سیر کراتے ہیں ورنہ اس کی زندگی خواجہ حسن نظامی کی ''گل بانو'' یعنی مغلیہ دور کی آخری شہزادی کی طرح گزرتی ہے۔ چاندنی

بیگم نے کچھ معصوم حسرتوں کو پال رکھا ہے جو مستقبل سے متعلق ہیں۔ چاندنی بیگم کے کچھ جملے معنی خیز اور سماجی اور دنیاوی مایوس کن حقیقتوں کی عکاسی کرتے ہیں:۔

"آنسو پھر رواں ہوئے۔ یا اللہ تو کائنات کو از سر نو بنا۔ سارے معاملات دنیا کے جو بگڑ گئے ہیں، اللہ تو بالکل شروع سے شروع کر دے تاکہ ایک بار پھر سے آدمی ٹھیک ہو جائے۔"

چاندنی بیگم پورے ناول کی فضا پر کہرے کی طرح چھائی ہوئی رہتی ہے۔ اپنی وفات کے بعد بھی موضوع بحث بنی رہتی ہے۔ تین کٹوری ہاؤس کے تقریباً سبھی افراد چاندنی بیگم کے ساتھ کیے گئے سلوک سے مطمئن نہیں ہیں۔ ان میں ایک قسم کا احساسِ افسوس اور شرمندگی دیکھنے کو ملتی ہے۔ وحی میاں اور صفیہ سلطانہ بمقابل اوروں کے کچھ زیادہ ہی حساس اور چاندنی بیگم کے ساتھ کیے گئے سلوک سے نادم ہوتے ہیں۔ صفیہ سلطانہ تو چاندنی بیگم کے نام سے STMOnil's Convent Dalibagh اسکول کھول کر سکون محسوس کرتی ہے۔

علیمہ بانو چاندنی بیگم کی ماں ہیں۔ یہ بنو بیگم یعنی بدر النسا کی بچپن کی سہیلی ہیں۔ ان کے شوہر نے پاکستان فرار ہو کر ان کو طلاق دے دی تھی۔ علیمہ بانو اعلیٰ تعلیم یافتہ خاتون ہیں انھوں نے اسکول میں پڑھا کر چاندنی بیگم کو اعلیٰ تعلیم دلائی۔ وہ صبر و تحمل کے ساتھ دو کمرے کے مکان میں گزر بسر کرتی ہیں۔ علیمہ بانو خوددار باعزت، دیانت دار اور پردے دار خاتون ہیں۔ غریب ہونے کے باوجود مذکورہ خصوصیات کی پاسداری کرتی ہیں۔ ان کو صرف ایک فکر بار بار ستاتی ہے وہ ہے ان کی بیٹی چاندنی بیگم کی شادی۔ اسی لیے جب بنو بیگم چاندنی بیگم کی شادی قنبر علی سے کرنے کی تجویز پیش کرتی ہیں تو وہ پہلے اپنی غربت کی وجہ سے متعجب ہوتی ہیں مگر بعد میں خوش ہوتی ہیں اور پر امید رہتی ہیں اور اسی امید کی کرن کے ساتھ دنیا کو الوداع کہہ دیتی ہیں۔

رانی صولت زمانی اسم با مسمیٰ ہیں۔ ان کا مزاج، ان کی زبان و لہجہ اور لوگوں سے ان کا برتاؤ وغیرہ ان کے مزاج کی پوری نشاندہی کرتے ہیں۔ رانی صولت زمانی ادنیٰ طبقے کے لوگوں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتی ہیں۔ ان کے برتاؤ اور بات چیت میں طنز و تحقیر کی بو ہوتی ہے۔ وہ سخت دل کردار ہیں۔ زمیں داری ختم ہو چکی ہے تاہم ان کا مزاج اب بھی زمیں دارانہ

ہے۔ وہ مردوں کی رنگین مزاجی اور جنسی بے راہ روی کو بخوبی جاننے والی عورت ہیں۔ اتنی رعب دار ہیں کہ ان کی بہوئیں انھیں دیکھ کر خائف ہو جاتی ہیں۔

صفیہ سلطانہ راجہ انوار حسین کی سب سے چھوٹی بیٹی ہیں۔ نہایت خوبصورت اور اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں اور نہایت حساس واقع ہوئی ہیں۔ خود مختاری اور خود اعتمادی ان کی شخصیت کے دو اہم پہلو ہیں وہ مغربی تعلیم اور طریقۂ تعلیم سے بے حد متاثر دکھائی دیتی ہیں جس کی وجہ سے ''سینٹ جانز کانونٹ'' انگلش میڈیم اسکول کھول لیتی ہیں۔

صفیہ کی شادی بچپن ہی میں قنبر علی سے تقریباً طے ہو چکی ہے تاہم قنبر علی بالغ ہونے کے بعد ترقی پسند خیالات اور مارکسی نظریات سے شغف کی وجہ سے امیر گھرانوں کی لڑکیوں سے شادی کرنے سے انکار کر دیتے ہیں ان کا جذبۂ رقابت اس وقت بھڑک اٹھتا ہے جب ابرار حسین کی شادی میں گاتی ہوئی بیلا کو قنبر علی عشقیہ نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

صفیہ کافی جذباتی، حساس اور عشق کے درد سے دوچار ہیں لیکن ان کے عشق میں رکھ رکھاؤ ملتا ہے۔ تاہم کسی موضوع پر اظہار خیال کرتی ہیں تو ان کا اندرونی درد و کرب، ان کی آواز سے جھلک جاتا ہے۔ صفیہ کھوئی کھوئی سی رہتی ہیں۔ خلوت ہو یا جلوت اپنی ایک ذہنی، اداس اور فلسفیانہ دنیا تیار کر لیتی ہیں۔ بزدل بھی ہیں۔ ان کے کردار میں عمر کے ڈھلنے کے ساتھ ساتھ وجدانی اور مذہبی کیفیت پیدا ہوتی جا رہی ہے۔

وہ، قنبر میاں سے ایک طرفہ عشق کر کے آخری عمر تک اس جال سے آزاد نہ ہو پائیں۔ قنبر ان کے عشق کو جاگیردارانہ رومانیت سے موسوم کرتے ہیں۔

صفیہ دن بہ دن بھیڑ بھاڑ سے دور اور الگ رہنے کی عادی ہوتی جا رہی ہیں۔ ان میں صوفیانہ میلان دن بہ دن ترقی پذیر ہے۔ وہ روز بہ روز احساسِ محرومی کی شکار ہوتی جا رہی ہیں۔ ان کے گھر کے افراد ان کی طرف مناسب توجہ نہیں دیتے۔ اسی لیے صفیہ سلطانہ ایک اپنی الگ دنیا بسا لیتی ہیں جو داخلیت سے عبارت ہے۔ کبھی کبھی اپنی داخلیت کی دنیا سے باہر قدم رکھتی ہیں لیکن تھوڑی ہی دیر بعد دوبارہ اپنی داخلیت کی کھوہ میں واپس چلی جاتی ہیں۔ ان کے کردار میں احساسِ کمتری اور افراد و اشخاص کے تئیں احساس تشکیک روز بروز بڑھتا جا رہا ہے۔ ان کے شعور اور تحت الشعور میں مسلسل کش مکش جاری رہتی ہے۔ اس سے ان کے

کردار میں احساسِ اجنبیت بڑھتا جا رہا ہے۔

صفیہ سلطانہ اچھی معلمہ ہیں۔ لیکن نہ صرف ایک ہاتھ سے معذور ہیں بلکہ بعد میں ان کی اپنی لاپرواہی اور بیزاری کی وجہ سے قوت سماعت میں نقص آجاتا ہے وہ اب زندگی سے بیزار ہوتی جا رہی ہیں۔ اب ان کے لیے زندگی اتنی بے مزہ ہوگئی ہے کہ صرف اور صرف کسی نہ کسی طرح زندگی کاٹنا چاہتی ہیں۔

وکی میاں ایک اعلیٰ مغربی تعلیم یافتہ شخص ہیں۔ وہیں سے شادی کر کے بیوی کو لا کر تین کٹوری میں رہتے ہیں۔ برطانوی بیوی کو جاگیر دارانہ نظام اور اقدار میں رہنا مشکل ہوتا ہے۔ مغربی تہذیب و اقدار کے مطابق یہاں بھی رہنا چاہتی ہیں جو کہ نہایت مشکل کام تھا۔ جب گھر والوں نے ان کو باہر نکلنے سے روکا تو وہ بھاگنے کی کوشش کرتی ہیں جس کی وجہ سے وکی میاں ان کو پیٹتے ہیں۔ بہر حال ایک روز وکی میاں کی بیوی تالی بجانے والوں کے ساتھ بھاگ کھڑی ہوتی ہیں جس سے وکی میاں کے ذہنی توازن پر برا اثر پڑتا ہے اور حد تو یہ ہے کہ گھر والے ان کو پاگل قرار دے دیتے ہیں۔

وکی میاں کے کردار کی دانشورانہ خامی یہ ظاہر ہوتی ہے کہ وہ ولایت میں شادی تو کر لیتے ہیں لیکن لگتا ہے کہ ان کو اس بات کی آگہی نہیں تھی کہ برطانوی لڑکی اپنی کلچرل اور اقداری خصوصیات کو لے کر ہندستانی جاگیر دارانہ معاشرے میں کیسے رہے گی۔ کیوں کہ ہندستانی کلچر اور آدابِ زندگی اور برطانوی کلچر اور آدابِ زندگی میں کافی فرق ہے۔

وکی میاں کے یہاں مذہب کی اندھی تقلید نہیں ملتی وہ مختلف علوم و فنون سے گہرا شغف رکھتے ہیں۔ نجی اور سماجی موضوعات پر ایک روادارانہ نظر رکھتے ہیں۔ اگرچہ وہ اپنی برطانوی بیوی کو ہنٹر سے پیٹتے تھے، ان کے کردار میں شادی کی ناکامی سے ایک خلا پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی ناکامی کے باعث وہ مزید حساس ہو گئے ہیں۔ ان کے گھر کے ماحول اور رویے نے ان کو ایک قسم کی نفسیاتی بیماری میں مبتلا کر دیا ہے۔ عورت، خصوصاً پڑھی لکھی خوبصورت شائستہ عورت ان کی نام نہاد نفسیاتی بیماری کا علاج ہے۔ چاندنی اور وکی میاں کی آپسی گفتگو نے ایک دوسرے کو متاثر کیا ہے اور جس خوشگوار ماحول اور فضا میں گفتگو ہوتی ہے اس سے قارئین کو دونوں معصوم کرداروں سے ہمدردی پیدا ہو جاتی ہے۔

وکی میاں کی شادی الا ئچی خانم کی نواسی سے ہو جاتی ہے۔ ان دونوں سے چار بچے دنیا میں قدم رکھتے ہیں۔ وقار حسین عرف وکی میاں اب ضعیف ہو چکے ہیں ان کی داڑھی کے بال سفید ہو گئے ہیں۔ وہ جذباتی اور حساس تو پہلے ہی تھے اب کچھ زیادہ ہو گئے ہیں۔ باغبانی اور علم نباتات پر کتابوں کا مطالعہ کرتے رہتے ہیں اور دیگر علوم و فنون پر مبنی کتابوں کو بھی دیکھتے رہتے ہیں۔ طرح طرح کے پودوں کی قربت میں وقت گزارتے ہیں۔

وکی میاں چھوٹے سے چھوٹے موضوع پر بڑے فلسفیانہ طریقے سے سوچنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ ان کے کردار میں علمیت، تفلسف، شاعری اور تصوف کی خصوصیات یکجا ہیں، اردو ادب سے گہرا شغف ہونے کی وجہ سے انھوں نے اردو ادب کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔

وکی میاں میں روز بروز مجذوبانہ کیفیت بڑھتی جا رہی ہے۔ خصوصاً جب وہ تنہا ہوتے ہیں تو ان کی زندگی کا یہ پہلو ظاہر ہوتا ہے۔ ان کی مجذوبانہ کیفیت خود کلامی کے ذریعے ظاہر ہوتی ہے جس میں احساسِ شکست اور ناآسودگی کی کیفیت محسوس ہوتی ہے۔ چاندنی بیگم کو تقریباً سبھی کردار یاد کرتے ہیں مگر وکی میاں چاندنی بیگم کو شدت کے ساتھ یاد کرتے ہیں۔ وکی میاں ہی صفیہ کے دکھ درد کو بھی بخوبی محسوس کرتے ہیں اور ان کا ساتھ دیتے ہیں۔ چونکہ دونوں نہایت حساس ہیں اس لیے دونوں ایک دوسرے کو سمجھنے کی نفسیاتی اہلیت رکھتے ہیں۔ صفیہ سلطانہ وکی میاں کے سوا ہر کسی کو مشکوک نگاہ سے دیکھتی ہیں اور ہر کسی کو اپنا حریف سمجھتی ہیں۔ اس کو احساسِ کمتری کا نتیجہ کہہ سکتے ہیں۔

بہار پھولپوری دبلے پتلے جسم کے ہیں اور لمبے بال رکھنے کے شوقین ہیں۔ عموماً شیروانی پہنتے ہیں۔ حلیہ غریبوں والا ہے۔ اگرچہ شاعر ہیں مگر تکلف اور نفاست جیسی خصوصیتوں سے آزاد ہیں۔ پھر بھی شاعرانہ تنک مزاجی اور ہلکی سی انانیت ان کے مزاج میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ فکر سخن اور گنگنانے میں محو رہتے ہیں۔ آگے چل کر یہ فلموں کے گانے لکھنے لگتے ہیں اور طرح طرح کے منصوبے بناتے رہتے ہیں۔ لیکن عمل، بمشکل کسی پر کرپاتے ہیں۔

بہار پھولپوری کی آواز سریلی ہے جس کی وجہ سے مشاعروں میں وہ کامیاب ہوتے ہیں اور دور دور تک لوگ ان کو سننے کو مشتاق رہتے ہیں۔ وہ برابر ماسٹر موگرے کی مدد کرتے ہیں۔ سچے دوست اور قابل یقین آدمی ہیں۔ ان کا حال بہتر سے بہتر ہوتا جا رہا ہے، پھر بھی

Scanned by CamScanner

ماضی کے معاشی حالات اور مددگاروں کو نہیں بھولتے۔ان کے کردار کی یہ اہم خوبی ہے۔

بہار پھولپوری تخیل پرست ہیں۔ یہ کوئی تعجب خیز بات نہیں کیوں کہ وہ معروف و مشہور شاعر ہیں۔ان کی ہر تجویز میں حقیقت سے زیادہ تخیل کا دخل ہوتا ہے۔ نسبتاً جوشیلے اور جذباتی ہیں۔ان کا اردو سے بہت گہرا تعلق ہے۔وہ اردو شاعری کی بدولت حاصل ہونے والی معاشی، سماجی اور ادبی حیثیت کو جذبۂ تشکر کے ساتھ محسوس کرتے ہیں۔اردو کے تئیں ایک قسم کی وفاداری بھی رکھتے ہیں۔اسی لیے اپنے فرزند سے کہتے ہیں کہ اردو کے لیے کچھ اہم کارنامے انجام دے تاکہ ان پر اس زبان و ادب کا جو قرض چڑھا ہوا ہے، کچھ کم ہو سکے۔

ابرار حسین عرف بوبی میاں بدچلن اور بدنیت کردار ہیں۔ تین کٹوری کے اچھے دنوں میں نوجوان لڑکیوں پر ڈورے ڈالنا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔زمیں داری کے خاتمے کے بعد ان کی بدچلنی کم تو ہو جاتی ہے لیکن ختم نہیں ہوتی۔ بوبی میاں کی غیر شریفانہ حرکتوں اور بری عادتوں سے ان کے گھر کی خادمائیں اچھی طرح واقف ہیں جس کی وجہ سے وہ ان کے درمیان اچھی نگاہ سے نہیں دیکھے جاتے۔ چاندنی بیگم اور وکی میاں کی ممکنہ شادی کی مخالفت کرتے ہیں۔ان کو کسی سے ہمدردی نہیں۔ان کو تقریباً اس بات کا یقین ہے کہ وکی میاں کے ذہنی اور نفسیاتی انتشار کے پیچھے ان کی پہلی شادی کی ناکامی ہے۔انھیں اس بات کا اندیشہ ہے کہ وکی میاں تعلیم یافتہ لڑکی سے شادی کر کے ٹھیک ہو جائیں گے ایسی صورت میں وہ وکی میاں کے حصے کی جائداد کو غصب کرنے میں کامیاب نہ ہو پائیں گے۔

بوبی میاں اپنی مقصد برآری کے لیے کوئی بھی حربہ اپنا سکتے ہیں۔ شروع شروع میں تین کٹوری ہاؤس کے بیشتر کردار وکی میاں کی چاندنی سے شادی کے خلاف ہوتے ہیں۔اس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے بوبی میاں اپنی ہوشیاری اور عیاری کو جمہوری رنگ بھی دینے کی کوشش کرتے ہیں۔اس طرح بوبی میاں بڑھتے ہوئے جمہوری نظام اور بدعنوان سیاست سے واقف نظر آتے ہیں اور اس کے موافق حربوں کے استعمال سے بھی واقف ہیں۔

وکی میاں اور چاندنی بیگم کی ممکنہ شادی کی فضا تیار ہونے لگتی ہے تو بوبی میاں پورے گھر کو بددماغ اور بُرا قرار دیتے ہیں۔ وکی میاں کے امراض کی تفصیل چاندنی بیگم سے ملاقات کر کے بتاتے ہیں اور شادی کی مخالفت میں چاندنی بیگم کو قائل کرنے کی حتی الامکان کوشش

کرتے ہیں۔ نہایت غیر ذمے دار اور لا پرواقسم کے آدمی ہیں۔ بہن صفیہ غیر شادی شدہ ہے۔ زرینہ سلطان اور وکی میاں کے بھی حالات ٹھیک نہیں ہیں۔ زمیں داری ختم ہو چکی ہے مگر اس کا اثر بوبی میاں پر کچھ نہیں پڑتا۔ وہ صرف انفرادی اور مادی نقطہ نظر سے سوچتے ہیں۔ بوبی میاں کی اپنے بھائی بہنوں سے نہیں بنتی اس لیے تعلقات منقطع ہو جاتے ہیں۔

پروین سلطانہ عرف چنی شادی کر کے پاکستانی شہری بن جاتی ہیں۔ پاکستانی قومیت ملنے کے بعد وہاں کے سماجی، ثقافتی اور معاشی حالات میں تحلیل ہو چکی ہیں اور اب صرف شلوار جمپر پہنتی ہیں۔ یہ بھول جاتی ہیں کہ ایک دن وہ بھی ہندستان کے سماجی، ثقافتی اور معاشی حالات کی پروردہ اور حصہ دار تھیں۔ شروع شروع میں وہ خود پاکستان میں دیگر پاکستانیوں کی امارت پرستی (Snobbery) کا نشانہ بنی تھیں۔ وقت کے ساتھ وہ بھی بدل گئیں۔ وہی سب کچھ کرنے اور کہنے لگیں جس کا وہ خود نشانہ بن چکی تھیں۔ اب وہ ہندستانی مسلمانوں یہاں تک کہ اپنے رشتے داروں کو بھی نہیں چھوڑتیں۔ اسی وجہ سے زرینہ سلطان اور پروین سلطان کے درمیان بڑی چشمک چلتی رہتی ہے۔

پروین نے وکی میاں کی شادی سے متعلق متضاد موقف اپنایا۔ پروین سلطان، زرینہ سلطان کے کردار میں ہمدردی اور ذمے داری کے احساس کی کمی کھٹکتی ہے اگر چہ بڑی بہن ہیں پھر بھی صفیہ سلطان کے لیے نہ صرف یہ کہ کچھ بھی نہیں کرتیں بلکہ ان کی زندگی سے متعلق بات کر کے لطف اندوز ہوتی ہیں۔ پروین امارت پرستی کی شکار ہیں۔ وہ اپنے کو اور اپنے بچوں کو دوسروں سے بہتر سمجھتی ہیں اور ہر وقت تقابلی برتری میں ڈوبی رہتی ہیں جبکہ ان کی بیٹی فیروزہ اس نسلی پہلو سے نالاں ہوتی ہے۔

زرینہ سلطانہ عرف جینی راجہ انوار حسین کی سب سے بڑی لڑکی ہیں ان کے کردار میں خود اعتمادی کی خاصیت پائی جاتی ہے۔ شاید خود اعتمادی کی وجہ سے ان کے شوہر سے ان کی نہیں بنتی تھی چنانچہ وہ کراچی چلے گئے۔ زرینہ سلطانہ اپنے تین بچوں کے ساتھ اپنے میکے میں رہتی ہیں اور مطلقہ ہیں۔

زرینہ اس بات سے فکر مند ہیں کہ پنکی میاں کی عمر کافی ہوتی جارہی ہے ان کی شادی فیروزہ سے کردی جائے۔ مگر فیروزہ اور ان کے بھائی منکر ہیں جس کی وجہ سے زرینہ ان

لوگوں سے نالاں ہیں اور اپنی ناراضگی کو ان لوگوں پر واضح بھی کر چکی ہیں۔ان کے کردار میں ہلکا سا چڑچڑاپن اور والدہ کا رعب بھی جھلکتا ہے۔زرینہ سلطان کے کردار میں مطلق العنانیت کی بو پائی جاتی ہے۔یہ بھی جاگیردارانہ سماج کی ذہنیت رکھتی ہیں۔ صفیہ کے مجذوبانہ حالات میں ان سے کوئی ہمدردی نہیں جتاتیں۔

زرینہ کے کردار میں نامساعد حالات نے جوانمردی کے ساتھ ابتر حالات سے نبٹنے کی خاصیت پیدا کر دی ہے۔زرینہ سلطان اور پروین سلطان کے درمیان ایک نہ ایک موضوع پر سنجیدہ بحث و مباحثہ اور چشمک جاری رہتی ہے۔جذباتی تعلق رکھتی ہیں۔

ذکی میاں پروین سلطانہ کے صاحبزادے ہیں اور ان کی پنکی میاں سے مختلف موضوعات پر لطیف چشمک چلتی رہتی ہے۔ان کے کردار میں بذلہ سنجی اور حاضر جوابی ملتی ہے۔ شاعرانہ مزاج رکھتے ہیں۔ معاشرے کی تبدیلی، سمت اور ٹھہراؤ وغیرہ پر نظر رکھتے ہیں۔ ظاہری تبدیلی کو جدیدیت سمجھتے ہیں۔ان کی اپنے گھر میں خوب چلتی ہے۔

پرویز مرزا عرف پنکی میاں زرینہ سلطان کے صاحبزادے ہیں بچپن میں بہت شریر تھے۔اردو پڑھنے سے گھبراتے تھے۔چاندنی بیگم کے چشمے کو توڑ ڈالا تھا۔اب بڑے ہو کر بلڈر (عمارتی ٹھیکیدار) اور آرکی ٹیکٹ (ماہر تعمیر) ہو گئے ہیں۔ پنکی میاں اردو زبان و ادب سے باقاعدہ واقفیت نہ ہونے کے باوجود دوسروں کی معلومات اور واقفیت کے سہارے اردو سے متعلق موضوعات پر اظہارِ خیال کرتے رہتے ہیں۔

پنکی میاں کی اچھی خاصی عمر ہو چکی ہے۔ابھی تک شادی نہیں کی ہے فیروزہ جو اُن کی خالہ زاد بہن ہیں، جوان ہو کر پاکستان سے ہندستان آتی ہیں تو پنکی میاں ان کو پسند کر لیتے ہیں لیکن فیروزہ اور ان کے بھائی شادی کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ پنکی میاں فیروزہ کے انکار کے بعد بظاہر خوش رہنے کی کوشش کرتے ہیں، گرچہ دل ہی دل میں نادم ہوتے ہیں۔

لیلیٰ سروش طاہر علی کی بیٹی ہیں جو ایم بی اے کیے ہوئے ہیں اور اپنے والد محترم کا کاروبار دیکھتی بھالتی ہیں۔ایک ایم بی اے کو جیسا ہونا چاہیے ویسی ہی وہ تیز طرار ہیں پنکی میاں ان کی صلاحیت کو دیکھ کر مرعوب ہوتے ہیں۔وہ ہر وقت ذہنی اور جسمانی طور سے مصروف رہتی ہیں اور ہر وقت چاق و چوبند رہتی ہیں لیلیٰ سروش نہ صرف جدید تعلیم و تربیت یافتہ کردار ہیں

بلکہ ان میں مذہبی عنصر بھی پایا جاتا ہے۔ وہ اپنی زمین پر عمارت کا کام شروع کروانے سے پہلے میلاد شریف کروانا چاہتی ہیں۔ وہ کافی باہمت کردار ہیں۔

لیلیٰ اپنی خوشی کو والد محترم کی خاطر قربان کر دینے کا شدید جذبہ رکھتی ہیں صنف نازک، بمقابل صنف سخت زیادہ جذباتی ہے۔ ایسا اس لیے ہے کہ عورت ذات پوری دنیا کے تمام معاشروں میں اور آج تک کی تاریخ میں محکوم، مفتوح اور کسی نہ کسی شکل میں استحصال شدہ رہی ہے۔ ان وجوہ سے بحیثیت مجموعی ایک ایسی نفسیات پیدا ہو گئی ہے جس میں جذباتیت، حسیت اور نرم مزاجی وغیرہ کی خاصیت شامل ہے۔ ان نفسیاتی اور مزاجی خصوصیات کے باعث وقت پڑنے پر ان سے وفاداری کی امید زیادہ کی جاتی ہے۔ عام طور سے وقت پڑنے پر بیٹیاں اپنے والدین کا ساتھ بخوبی دیتی ہیں۔ لیلیٰ گرچہ پیشہ ور ذہن رکھتی ہیں مغربی اور جدید تعلیم سے آراستہ ہیں تاہم والدین کا ان کی ضعیفی اور دیگر مصائب میں اپنی خوشی کو قربان کر کے ساتھ دیتی ہیں۔

طاہر علی سروش شیخ قنبر علی کے کزن ہیں جو کلکتے میں مقیم ہیں۔ شوقیہ گولف کھیلتے ہیں ہلکے پھلکے شاعر بھی ہیں سروش تخلص رکھتے ہیں۔ مشاعروں کی صدارت بھی کرتے ہیں قنبر علی کے سانحے اور ان کی زمین پر ماسٹر موگرے کے قبضے کی خبر اخبار میں پڑھی اور پڑھ کر متعجب ہوئے طاہر علی کے چھوٹے بھائی مشرقی پاکستان میں رہتے ہیں جو ہاتھیوں اور ٹھیکوں کا خاندانی کام سنبھالتے ہیں۔ طاہر علی شروع میں ہاتھیوں اور جنگلات سے زیادہ وابستہ ہوتے ہیں اس لیے گھر سے باہر رہنے کے شائق ہوتے ہیں اسکول میں پہلے ان کو ایلیفنٹ بوائے کہا جاتا تھا اب ان کی لڑکی کو ایلیفنٹ گرل کہا جاتا ہے۔

طاہر علی کافی مشہور شخص ہیں کلکتے سے لکھنؤ تک ان کا اثر ورسوخ ہے جو قنبر علی سے ان کے رشتے کو متعین کرنے میں معاون ثابت ہوتا ہے اور آگے چل کر ماسٹر موگرے سے ان کے مقدمے میں ان کی مدد کرتا ہے۔

طاہر علی کاروباری نقصان اور بھائی مظہر علی کے گھریلو مصائب سے تڑپ تڑپ کر دنیائے فانی سے کوچ کر جانے کی وجہ سے اپنے ماضی اور حال سے بیزار ہیں اپنے ماضی اور حال کا تجزیاتی مطالعہ کرتے ہیں اور احساسِ شکست سے دوچار ہوتے ہیں طاہر علی فیل فروش کے

کردار میں تاریخی آگہی اور ایک قسم کی ماضی پرستی دیکھنے کو ملتی ہے۔ طاہر علی انسان اور انسان کے آپسی رشتے اور ان کی خواہشات اور ضروریات اور ان کی غیر مطمئن انفرادی اور اجتماعی حیثیت اور اقتدار حاصل کرنے کی جبلت سے بخوبی واقف ہیں۔ وہ تجربہ کار مگر نرم دل انسان ہیں۔ ناسازگار انفرادی اور سماجی حالات سے متاثر ہو کر اشکبار ہو جاتے ہیں۔ اپنے بھائی مظہر علی کے دردناک اور عبرتناک حالات سے سبق حاصل کرتے ہیں اور تمنا کرتے ہیں کہ ان کی بیٹی لیلیٰ ان کی آنکھوں کے سامنے حجلۂ عروسی میں قدم رکھے۔ تقریباً ہر انسان کی طرح وہ بھی اپنے پورے کارناموں سے غیر مطمئن ہوتے ہیں۔ طاہر علی جام مے سے بھی شوق کرتے ہیں۔

فیروزہ نے مغربی ممالک میں تعلیم حاصل کی ہے۔ اسے مغربی معاشرے کو نزدیک سے دیکھنے اور مشاہدہ کرنے کا موقع ملا ہے واپسی پر وہ برصغیر اور مغربی معاشرے پر تقابلی نگاہ رکھتی ہے جو کہ فطری بات ہے ملک سے دور رہ کر بیگانی سی ہو گئی ہے۔ فیروزہ کے کردار میں حاضر جوابی اور بذلہ سنجی کی خوبی ملتی ہے۔

منشی بھوانی شنکر سوختہ پرانی وضع کے آدمی ہیں مذہبی اور دیانتدار۔ اظہر علی کے اہم خدمتگاروں میں شمار ہوتے ہیں ان کو سارا گھر عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور یہ گھر کے ایک اہم فرد کی حیثیت رکھتے ہیں عرصۂ دراز سے اظہر علی کی منشی گیری کرتے ہیں اردو اور فارسی میں قابلِ لحاظ معلومات رکھتے ہیں۔ مختلف الذوق واقع ہوئے ہیں۔ انھیں اپنے عہد کے تقریباً تمام مروجہ علوم وفنون سے دلچسپی ہے۔ یہ قنبر علی کے بزرگ کا درجہ رکھتے ہیں گھر کی مجموعی دیکھ ریکھ کے علاوہ فون آپریٹر کے فرائض بھی انجام دیتے ہیں۔

منشی بھوانی شنکر سوختہ ریڈرز" میگزین کے قانونی مشیر ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قانون داں بھی ہیں۔ وہ مشترکہ تہذیب وتمدن کے ایک چراغ کے مانند دکھائی دیتے ہیں۔ ان کا سلوک لوگوں سے بہت منصفانہ ہے۔ وہ اپنی عمر اور حیثیت کے مطابق کافی سمجھ دار اور سوجھ بوجھ کے آدمی لگتے ہیں۔ "گلِ سرخ" جو اردو میں شائع ہوتا ہے اس کے ادبی حصے کی ادارت بھی کرتے ہیں۔ قنبر علی کو بیٹے کی طرح چاہتے ہیں۔ قنبر علی کے نظریات سے بھی وہ متاثر ہیں اور اس تاثر میں ان کی وفاداری شامل ہے۔ وہ اپنے ادبی ذوق کو غزل کی شکل میں

پیش کرتے ہیں جس کا انداز اور خیال ترقی پسندانہ ہوتا ہے۔ ان کی غزلیں "گلِ سرخ" میں بعض اوقات شائع بھی ہوتی ہیں۔

بھوانی شنکر سوختہ قنبر علی کے والد کے کلرک کی حیثیت سے مکر و فریب کے مقدمات کا چالیس سال کا تجربہ رکھتے ہیں اس تجربے کی مدد سے قنبر علی کی شادی کے پس پشت جعل سازی اور جعل ساز ماسٹر امام بخش موگرے کی نیت کو بھانپ چکے ہیں۔ کم گو شخص ہیں اپنے کام میں بڑی مستعدی سے وفاداری کے ساتھ مصروف رہتے ہیں۔

الحمد و بیوہ ہیں جو اظہر علی کے گھر کی خادمہ ہیں۔ اظہر علی کے گھر کے کام کاج اور دیگر خادماں کی دیکھ ریکھ کرتی ہیں۔ یہ دیگر خادماؤں اور ملازمین کی طرح نہایت وفادار کردار ہیں۔ اظہر علی کے گھر کے ضابطۂ زندگی اور دیگر لوازمات سے بخوبی واقف ہیں۔ قنبر علی کا بیٹے کی طرح خیال رکھتی ہیں قنبر علی کی ازدواجی زندگی کی ابتر حالت سے کافی متفکر نظر آتی ہیں۔ مذہب کی بڑی پابند ہیں۔ نمازِ تہجد بھی پڑھتی ہیں۔

الا بچی خانم اونچی ذات کی پٹھانی ہیں۔ بوبی میاں کی مادیت اور عیاری کو ناپسند تو کرتی ہیں مگر ان کی تمام باتوں سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ بھی وکی میاں اور چاندنی بیگم کی ممکنہ شادی سے متفق نہیں کیوں کہ وہ چاہتی ہیں کہ وکی میاں کی شادی ان کی نواسی سے ہو جائے۔ اس موضوع پر رانی صولت زمانی نے ایک مرتبہ اشارہ بھی کیا تھا اس طرح ان کے کردار میں خود غرضی کی خاصیت پائی جاتی ہے۔ "بتاشن" بہت متوازن کردار کی مالک ہے اور تنقید کی بصیرت رکھتی ہے۔ وکی میاں اور چاندنی بیگم کی شادی سے متعلق لوازمات پر جس طرح سے روشنی ڈال کر چاندنی بیگم کو سمجھاتی ہے وہ اس کے متوازن کردار پر دلالت کرتا ہے۔

پریزادہ گلاب ایک مزاحیہ کردار ہے اس کے کردار میں آوارہ پن اور غنڈہ گردی کی بو پائی جاتی ہے۔ بدزبان، کام چور اور لالچی ہے۔ یہ موقع محل کے مطابق جھوٹ بھی خوب بولتا ہے تاکہ مخاطب کو متاثر کر کے اپنا مقصد حاصل کر سکے۔ عمر اور فیشن کے مطابق اپنے کو تبدیل کرتا رہتا ہے۔ مختلف پیشے اختیار کرتا ہے اور اس کے مطابق اپنے کو تبدیل کرتا رہتا ہے۔ مگر اس کو کسی پیشے میں سکون نہیں ملتا۔ اس کی ازدواجی زندگی بھی غیر مستحکم ہوتی ہے کیوں کہ وہ مزاجاً غیر مستحکم ہے۔ یکے بعد دیگرے کئی شادیاں کرتا ہے مگر جنسی نفسیاتی اور

مزاجی نا آسودگی کے باعث ایک پختہ اور پُر سکون زندگی سے محروم رہتا ہے یہ کردار اپنی ناکامیوں اور بدتر سماجی حالات کی وجہ سے پوری دنیا سے بیزار رہتا ہے۔

پریزادہ گلاب اپنی چال ڈھال سے فلمی ویلن دکھائی دیتا ہے۔اس کے دماغ میں ہر وقت کوئی نہ کوئی خرافات پیدا ہوتی رہتی ہے۔ ہر وقت کچھ نہ کچھ کرنے کی سوچتا رہتا ہے مقامی زبان اور لہجہ اپنانے میں مہارت رکھتا ہے۔

چنبیلی بیگم پریزادہ گلاب کی ماں ہیں خوبصورت اور خوش سیرت خاتون۔ پہلے فلموں میں سائڈ رول ملنا شروع ہوا لیکن موٹاپا آنے پر بند ہو گیا تو اسٹوڈیو کے باہر برگد تلے قورمہ پراٹھا اور کباب بیچنا شروع کیا جس کے توسط سے ایک ہیرو تک رسائی ہوئی۔ چنبیلی بیگم کو اپنی بیٹی بیلا شوخ سے بہت محبت ہے۔ چنبیلی بیگم کافی ضعیف ہو چکی ہیں تاہم کنگن اور چوڑی وغیرہ پر کافی دھیان دیتی ہیں ان کے شوہر ابھی زندہ ہیں تو پھر وہ کیوں بیوہ کی طرح رہیں۔

چنبیلی بیگم اپنی سماجی اور معاشی حالت سے مطمئن نہیں ہر بات پر مایوسی کا اظہار اور ہر وقت ناامیدی کا شکار رہتی ہیں۔

ماسٹر امام بخش موگرے کام چلاؤ انگریزی اور اردو کے بھاری بھر کم الفاظ استعمال کرنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ مخاطب متاثر ہو سکے۔ خوشامد پسند ہیں۔ مختلف جانوروں کی آواز نکالنے کا فن جانتے ہیں۔ ماسٹر موگرے مقدمہ ہارنے اور اپنی معاشی اور جسمانی پریشانیوں کے باوجود ہمت نہیں ہارتے۔ بڑے صبر و تحمل سے کام لیتے اور دوستی کرنا خوب جانتے ہیں۔ جہاں کہیں بھی جاتے ہیں کوئی نہ کوئی دوست پیدا کر لیتے ہیں۔ ان کے اندر امید کی کرن ہر وقت روشن رہتی ہے۔

مسز ڈھونڈی تین کٹوری ہاؤس والوں کی اچھی دوست ہیں اور شیریں کاسل میں بیٹے فرہاد عرف قلی اور بیٹی مہناز کے ساتھ رہتی ہیں تین کٹوری ہاؤس والوں کے لیے شادی کے موضوع پر مشیر کی حیثیت رکھتی ہیں انگریزی اور اردو بولتی ہیں۔ ان کی اردو میں انگریزی زبان کی نحوی خاصیت ملتی ہے کیوں کہ ترجمہ کر کے اردو بولتی ہیں۔ ان کی زبان میں تلفظ اور تذکیر و تانیث کی بڑی غلطیاں رہتی ہیں۔ شادی کروانا ان کا دلچسپ مشغلہ ہے۔ وہ نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کو چاہتی ہیں کہ جلد از جلد مناسب شادی کر لیں۔ تمام مذاہب کی برابر

قدر کرتی ہیں اور بُرے وقت میں تمام مذاہب کا سہارا لیتی ہیں۔

بہار آرا بیگم الا ئچی خانم کی نواسی اور وکی میاں کی بیوی ہیں کم سخن، شریف النفس اور تمام الجھنوں اور کدورتوں سے دور رہنے والی خاتون ہیں۔

سونا کلی ہمدردی اور نیک نیتی کے خوبصورت لباس میں ملبوس ہے وہ چاہتی ہے کہ وکی میاں اور چاندنی بیگم کی آپس میں شادی ہو جائے اور دونوں خوشگوار ماحول میں خوشگوار زندگی گزاریں یہ دیگر خادماؤں کی عیاری سے متنفر ہے۔

قرۃالعین حیدر اپنے ناولوں کی شروعات مختلف انداز سے کرتی ہیں کبھی فلسفیانہ انداز تو کبھی منظر یہ انداز اور کبھی مجتسا انداز ہوتا ہے ان کے یہ مختلف انداز قارئین کو متوجہ کرنے اور ناول نگار کے مافی الضمیر کو واضح کرنے میں مددگار ہوتے ہیں۔

"چاندنی بیگم" کی شروعات منظر یہ انداز سے ہوئی ہے تاہم منظر نگاری کرتے وقت وہ چھوٹی چھوٹی چیزوں کو فلسفہ حیات کی مہک سے معطر کرتی چلتی ہیں۔

"کٹر کٹری مٹی کے اندر کیچوے اپنے کام میں لگے رہتے ہیں۔ ساری عمر اپنے کام میں مصروف، خیر کیچوؤں کی کیا عمر اور کیا زندگی مگر وہ اپنے گھر بنانے میں جٹے ہوئے ہیں اور گیلی مٹی کی ننھی ننھی ڈھیریاں بناتے رہے ہیں۔"

اس ناول میں مس حیدر کے طنز میں مزاح کم اور تلخی زیادہ دیکھنے کو ملتی ہے انوار حسین کے کسی پُرکھے نے کیتھ کے جنگل میں ایک درویش کو تین کٹوری ستو پلایا تھا جس کی دعا سے ان کو بادشاہ نے جاگیر عطا کی تھی جس کو بعد میں ریاست تین کٹوری کہا جانے لگا لیکن ان کے بدخواہ ان کی تین صاحبزادیوں کو تین کٹوریوں سے یاد کرنے لگے۔

"راجہ انوار حسین کے بدخواہ ان کی تین صاحبزادیوں کو تین کٹوریوں کے نام سے یاد کرتے۔"

ناول میں حاضر جوابی پر مبنی جو لطیف مزاح ملتا ہے وہ دلکش ہوتا ہے ملاحظہ ہو:

"کامریڈ (قنبر علی کا اصرار تھا کہ سب انھیں کامریڈ کہیں) کسی مہیلا کا فون ہے کہتی ہیں فوراً بات کیجیے زندگی اور موت کا سوال ہے۔"

ان سے کہو پانچ منٹ بعد کنویں میں کود یں۔"

لفظیات میں ہندی، انگلش، عربی، فارسی اور مقامی بولیوں کے الفاظ پائے جاتے ہیں۔
ناول میں لوک گیتوں کا استعمال کر کے ایک خاص دور اور طبقہ اعلیٰ میں ان کی اہمیت اور چلن کو واضح کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ دیہی زندگی کی رنگارنگی کی عکاسی کی ہے۔ بیلا قنبر علی کو اپنے بارے میں بتاتے ہوئے کہتی ہے:

''شادیوں میں اماں سے ایک گانا اکثر سنا جاتا۔ اوہی رے دیس بابل چنری بھئی مہنگی تو سندور ہوا بڑا مول رے۔ اوہی سندورا کے کارن چھوٹا ہے بابل کا دیس رے۔''

مِس حیدر ایک قسم کا ڈرامائی واقعہ پیش کر کے بھی مزاح پیدا کرتی ہیں لیکن ان کے مزاح میں زیرِ لب تبسم کی کیفیت ہوتی ہے۔

مِس حیدر کہانی کے اندر سے کہانی پیدا کرتی ہیں وہ کرداروں کے حالیہ شب و روز کو ماضی سے وابستہ کر کے نہ صرف قصے میں تہہ داری لاتی ہیں، کرداروں کے ماضی سے قارئین کو واقف بھی کراتی ہیں جس سے کہانی میں شاخ در شاخ کیفیت اور ایک طرح کی پیچیدگی آجاتی ہے۔

مِس حیدر کے طنز کسی نہ کسی سماجی پہلو پر وار ہوتے ہیں جو ان کی عصری آگہی کی نشاندہی کرتے ہیں۔ اردو رسم خط اور اردو کی ہندستان میں موجودہ حیثیت اور استحصال کی طرف طنزیہ اشارہ کرتی ہیں۔ بہار پھولپوری ماسٹر موگرے سے کہتے ہیں:۔

''آپ کو یہ بھی بتلا سکتے ہیں کہ کس شاعر کی اسٹار ویلیو اس وقت کیا ہے۔
کیوں کہ ہندستان میں ہماری پیاری چہیتی مادری زبان اردو اب ایک انٹرٹین منٹ انڈسٹری میں تبدیل ہو چکی ہے۔''

مِس حیدر کا مزاج بڑا شاعرانہ ہے اسی لیے انھوں نے اپنے ناول چاندنی بیگم میں اردو شعروں کو مختلف طریقوں سے معنویت، مقصدیت اور موزونیت کے ساتھ استعمال کیا ہے بعض مقامات پر صرف ایک ہی مصرعے سے مقصد برآری کرلی ہے۔ اور بعض اوقات ایک ہی مصرعے کے کچھ الفاظ استعمال کر کے اپنی بات کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ کہیں کہیں انھوں نے کسی ادبی تصنیف کا نام یا نظم کا عنوان لکھ کر قارئین کو محظوظ کرایا ہے۔ انھوں نے لوک گیتوں کا بھی استعمال کیا ہے۔ بعض مقامات پر انھوں نے انگریزی کے بھی اشعار کا

استعمال کیا ہے۔ بیشتر اشعار کا استعمال تشبیہاتی، استعاراتی اور تلمیحی ہے۔ شعروں کے مختلف طرح کے استعمال سے ناول میں فضائیہ تبدیلی ہوتی رہتی ہے جس سے قاری یکسانیت اور ذہنی تشنج سے دوچار ہونے سے بچ جاتا ہے اور اس کی دلچسپی برقرار رہتی ہے:

قرۃ العین حیدر نے اس ناول میں موقع و محل کے مطابق حالات و کیفیات کی نسبت سے اشعار کو معنی خیزی کے ساتھ کھپایا ہے جس سے ناول میں قارئین کی دلچسپی برقرار رہتی ہے اور بعض اوقات بڑھ جاتی ہے ساتھ ہی ساتھ پوری مثنوی یا نظم کی طرف اشارہ کر کے قارئین کو تھوڑی دیر کے لیے کسی دوسری دنیا کی سیر کراتی ہیں اس طرح ان کے علم و ذہن کے اُفق میں وسعت آ جاتی ہے۔

مس حیدر کے یہاں بُت شکنی (Iconoclasm) ملتی ہے جس میں وہ مشہور و مقبول رسوم و عقائد پر حملہ آور ہوتی ہیں تاہم ان کی بُت شکنی عصمت چغتائی کی نوعیت کی نہیں ہوتی (جن کے ہاں کھلاپن اور بغاوت ملتی ہے اور بغاوت کے بعد انفرادی اور اجتماعی زندگی کے تئیں صحت مند نظریے کی کمی کھٹکتی ہے) بلکہ ان کے ہاں ایک توازن اور دانشورانہ سمجھ بوجھ دیکھنے کو ملتی ہے: قنبر علی اپنے والدین سے بحث کرتے ہیں:

"میاں جان۔ وہ انگلش ڈپارٹمنٹ میں ماڈرن لٹریچر ایم اے کلاس کو پڑھاتی ہیں۔ ان کی دو شاگردوں کی ہوگئی شادی، وہ مانگ میں خوب سندور رچا کر آنے لگیں۔ شربری ان دنوں سارتر پڑھا رہی ہیں۔ ان سے کہا جب تم لوگ مانگ میں اتنا سیندور بھروگی سارتر تمھاری سمجھ میں کیا آئے گا۔"

بیرسٹر صاحب مسکرائے "سیندور کا سارتر سے کیا تعلق ہے؟"

"میاں جان! سیندور ہندو عورتوں کی غلامی کی نشانی ہے۔ دقیانوسیت کا سمبل۔ ہمارے ں کانچ کی چوڑیاں۔ حیدر آباد میں کالی پوتھ۔ ساؤتھ میں منگل سوتر۔"

"بیٹا سہاگنوں کے لیے تو ان چیزوں کی بڑی اہمیت ہے" بنو بیگم نے کہا

"مرد کیوں نہیں پہنتے۔ شادی کے بعد ناک میں سیفٹی پن ہی لٹکا لیا کریں۔" (ص-43)

مس حیدر جب کسی موضوع پر فلسفیانہ یا لمبی اکتا دینے والی بحث چھیڑتی ہیں تو تھوڑی دیر بعد وہ خود محسوس کر لیتی ہیں اور اسے دور کرنے کے لیے وہ کئی فنی سہارے لیتی ہیں جن میں

استعاراتی فضا آفرینی اور معنی خیز منظر کشی اہم ہیں جو آگے اور پیچھے کے واقعات سے متعلق اور مماثل ہوتے ہیں۔

مس حیدر کا مشاہدہ بہت تیز ہے۔ وہ جزئیات نگاری تو نہیں کرتیں لیکن ماحول سازی اور فضا آفرینی میں غضب کا فنکارانہ ذہن رکھتی ہیں۔ وہ بخوبی جانتی ہیں کہ وہ کون سے پہلو یا نکات ہیں جن کو پیش کرنے سے ان کا مقصد حاصل ہو جائے گا۔ وہ دنیا کی ہر شے میں تبدل کی مضمر جبلت کو جانتی سمجھتی اور فلسفہ تسلسل اور تبدل کو اپنے اطراف و جوانب کی اشیاء اور اقدار میں بخوبی مشاہدہ کرتی ہیں اور فنکارانہ طریقے سے پیش بھی کرنا جانتی ہیں وقت کے تسلسل کو ذیل کے اقتباس میں دیکھا جا سکتا ہے:

"دھوپ درختوں پر سے اتر کر ندی کی طرف سرکتی جارہی تھی۔ اس پار بہت دور ریڈ روزا اپنے ہرے بھرے گھنے باغ میں چھپا ہوا تھا۔ گومتی کا پانی پگھلا سونا بن گیا پھر تانبا۔ بہت جلد رات بھی ہو جائے گی۔ زندگی کا ایک بے مصرف لایعنی مایوس سنسان دن نبڑ گیا۔"

"چاندنی بیگم" کی زبان کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک انگریزی دوسرے بگڑی ہوئی اردو اور تیسرے سلیس اردو۔ انگریزی اور بگڑی ہوئی اردو کا استعمال کرداروں کی نسبت سے ہوا ہے جو ناول کو حقیقت سے قریب کرتے ہیں۔

□□□

National Council for Promotion of Urdu Language
Quarterly "FIKR-O-TAHQEEQ" New Delhi
Vol. V April, May, June 2002 Issue - 2

سہ ماہی فکر و تحقیق نئی دہلی

(علمی و تحقیقی جریدہ)

اس شمارے کی قیمت : 25 روپے
زرِ سالانہ : 100 روپے
رجسٹرڈ ڈاک سے : 200 روپے

طابع اور ناشر : ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغِ اُردو زبان
محکمہ ثانوی و اعلا تعلیم، وزارت ترقیِ انسانی وسائل، حکومتِ ہند
ویسٹ بلاک-1، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی
فون - 6103938, 6103381

مدیر : ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ
مشیر : مخمور سعیدی

ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان نے لبرٹی آرٹ پریس، دریا گنج، نئی دہلی ۔110002 میں چھپوا کر شائع کیا۔

مُدیر

ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ

مشیر

مخمور سعیدی

سہ ماہی
فکر و تحقیق
نئی دہلی